تقی الدین النبہانی

جماعت سازی

(التکتل حزبی)

حزب التحریر

پہلا ایڈیشن: 1372ہجری - 1953ء

چوتھا ایڈیشن: 1422ہجری - 2001ء

(اردو ترجمہ - 2009ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت سازی

(التکتل الحزبی)

تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) سے امتِ مسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں، مگر یہ تمام اپنی کوششوں میں ناکام رہیں۔ تاہم ان تحریکوں نے اُن تحریکات کو بہت متاثر کیا جو اِن کے بعد اِسی مقصد کے حصول کے لیے قائم ہوئی تھیں۔ اِن تحریکات کا مطالعہ کرنے والا اور نشاۃِ ثانیہ کے حوالے سے اِن کی کوششوں کو باریک بینی سے دیکھنے والا یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ ان تمام تحریکوں کی ناکامی کا بنیادی سبب، ان کی جماعت سازی کے پہلو سے، درج ذیل چار خامیاں ہیں:

اول: ان کی بنیاد ایک ایسی عام غیر متعین فکر (فکرۃ-idea) پر رکھی گئی تھی جو یا تو بالکل مبہم تھی یا نیم مبہم تھی، اس کے علاوہ یہ فکر نہ صرف غیر مرتکز تھی اور شفافیت سے عاری تھی بلکہ اِس میں خالصیت کا بھی فقدان تھا۔

دوم: ان تحریکوں پر اپنی فکر کو نافذ کرنے کا طریقہ (method) بھی واضح نہ تھا، بلکہ یہ تحریکات اپنی فکر کے نفاذ کی کوشش میں بیساختہ اور کج روی پر مبنی ذرائع اختیار کرتی تھیں، اس سے بڑھ کر یہ ذرائع غیر واضح اور مبہم تھے۔

سوم: یہ تحریکیں ایسے اشخاص پر بھروسہ کرتی تھیں جن کے اندر صحیح اور مکمل بیداری تھی نہ ہی یہ صحیح اور پختہ ارادوں کے مالک تھے، بلکہ یہ ایسے اشخاص تھے جن کے اندر فقط جوش و جذبہ اور دلیری تھی۔

چہارم: وہ افراد جن پر اِن تحریکات کی ذمہ داری تھی، اُن کے درمیان صحیح ربط و تعلق موجود نہیں تھا بلکہ اِن تحریکوں میں لوگوں کی جماعت سازی اس انداز سے تھی کہ جماعتی تعلق کا اظہار محض کچھ ظاہری اعمال اور عہدوں کی شکل میں ہوتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں کی ناکامی ایک طبعی بات تھی، جب تک ان کے پاس جدو جہد اور جوش کا سرمایہ باقی رہا یہ تحریکیں چلتی رہیں اور جب یہ سرمایہ ختم ہوگیا تو یہ تحریکیں آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑ گئیں اور پھر بالآخر ختم ہوگئیں۔ اِن کے بعد کچھ اور افراد نے انہی بنیادوں پر نئی تحریکیں شروع کیں، جو ایک مدت تک چلتی رہیں اور بالآخر جوش و جذبہ ختم ہونے پر یہ بھی ختم ہوگئیں۔ یوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

ان تمام تحریکوں کی ناکامی ایک طبعی امر تھا کیونکہ یہ سب کسی صحیح، واضح اور متعین فکر (فکرۃ) پر قائم نہیں ہوئیں تھیں، اِس کے ساتھ ساتھ اِن کے پاس صحیح طریقہ بھی موجود نہ تھا۔ اِسی طرح یہ اُن افراد پر بھروسہ کرتی تھیں جن کے اندر مکمل بیداری نہ تھی اور نہ ہی یہ صحیح ربط و تعلق کی بنا پر مربوط تھے۔

جہاں تک 'فکر اور طریقے' کا معاملہ ہے تو اِن تحریکات کی فکر اور طریقہ دونوں غلط تھے کیونکہ اُس کی بنیاد غلط فلسفے پر تھی، اگر ہم مان لیں کہ اُن کے پاس کوئی فلسفہ یا نظریہ موجود تھا۔ اِن میں سے کچھ تحریکات اسلامی تھی اور کچھ قومیت کی بنیاد پر قائم ہوئی تھیں۔ وہ افراد جو اسلامی تحریکات سے وابستہ تھے، وہ لوگوں کو ایک عامیانہ اور غیر واضح انداز میں اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے۔ وہ لوگ اسلام کی ایسی تشریح کرنے پر لگے ہوئے تھے کہ اسلام موجودہ حالات کے مطابق ہو سکے یا اُنہیں غیر اسلامی قوانین کو اسلام کے اندر داخل کرنے کا جواز مل جائے تاکہ اسلام

کفریہ نظامہائے حیات کے مطابق ہو سکے۔ یا پھر ایسا جواز مل جائے کہ جس سے اِن کفریہ نظاموں کو ہی برقرار رکھا جا سکے یا اِن سے قوانین اخذ کئے جا سکیں۔ اور جہاں تک اُن تحریکوں کا تعلق ہے جو قومیت کی بنا پر قائم کی گئی تھیں تو اُن میں سے عرب لوگ نہایت مبہم اور غیر واضح انداز میں اسلام اور مسلمانوں کو نظر انداز کرتے ہوئے عرب قوم کو صرف قومیت کی بنیاد پر نشاۃِ ثانیہ کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ وہ اپنے مقصد کے لیے چند اصطلاحوں کا استعمال کرتے تھے جیسا کہ قومیت، عزت، شرافت، عرب، عرب ازم، آزادی اور اِن جیسے دوسرے الفاظ، اگر چہ اُن کے ذہنوں میں اِن اصطلاحوں کا تصور بھی واضح نہ تھا اور یہ بھی واضح نہ تھا کہ یہ اصطلاحات نشاۃِ ثانیہ کی حقیقت کے موافق بھی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو عرب قوم پرست، عربوں کو عرب نشاۃِ ثانیہ کی دعوت دے رہے تھے تو دوسری طرف ترک قوم پرست ترک قومیت کی بنیاد پر ترک سرزمین کی نشاۃِ ثانیہ کی بات کر رہے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ عرب قوم پرستوں اور ترک قوم پرستوں کی سرپرستی استعماری کفار خود کر رہے تھے۔ اور اِن استعماری کفار نے بلقان کے علاقے کو عثمانی ریاست، جو کہ اسلامی ریاست تھی، سے علیحدہ کرنے کے لیے ایسی قومی تحریکوں کی ہی سرپرستی کی تھی۔

عالم عرب میں اسلامی اور قومی دونوں تحریکوں کے افراد کے درمیان اخبار و جرائد میں ایک بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔ یہ بحث و مباحثہ اِس نقطے پر مرکوز تھا کہ آیا عرب لیگ زیادہ قابلِ عمل اور بہتر ہے یا اسلامی لیگ؟ چنانچہ اِس بحث و مباحثے میں ایک طویل مدت تک ایسی کوشش صَرف کی گئی جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کیونکہ درحقیقت یہ ایک استعماری منصوبہ تھا تا کہ لوگوں کے اذہان سے اسلامی ریاست کے تصور کو اوجھل کیا جائے۔ چنانچہ اِس کے نتیجے میں نہ صرف لوگوں کی کوششیں ضائع ہوئیں بلکہ بات اس سے بھی آگے بڑھی اور اسلامی ریاست کا معاملہ لوگوں کے ذہنوں اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اِن اسلامی اور قومی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مختلف اسلامی ممالک میں کچھ وطنیت پر مبنی تحریکات بھی وجود میں آئیں۔ دراصل یہ تحریکات اسلامی ریاست کے مختلف حصوں پر استعماری

کفار کے قبضے کے ردِّعمل کے طور پر وجود میں آئیں تھیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے نفاذ سے مسلمانوں پر ہونے والا سیاسی اور اقتصادی ظلم اِن تحریکوں کے قیام کی وجہ تھا۔ اگر چہ اِن وطنیت پر مبنی تحریکوں کا قیام اِن مصائب کی وجہ سے تھا تاہم اِن میں کچھ تحریکات پر اسلامی جذبات کا غلبہ تھا، جبکہ دیگر تحریکوں پر خالصتاً وطنیت کا غلبہ تھا،اور یہ حقیقت میں اُن مصنوعی تحریکات میں سے تھیں جنہیں کافر استعمار بذاتِ خود وجود میں لایا تھا۔ ان تحریکوں کا محرک وطنیت تھی اور اِن تحریکات نے امت کو ایک سطحی قسم کی جدوجہد میں مصروف کردیا، جس نے دشمن کا وجود ختم کرنے کی بجائے اُس کی جڑیں اسلامی علاقوں میں مزید مستحکم کردیں۔ اور بالآخران تحریکوں کا وجود ماند پڑ گیا۔

ہمارا اعتقاد ہے کہ نشاۃِ ثانیہ کا حقیقی فلسفہ وہ آئیڈیالوجی ہے جو فکر اور طریقہ پر مشتمل ہوتی ہے، یہ آئیڈیالوجی اسلام ہے کیونکہ اسلام ایک ایسا عقیدہ ہے کہ جس سے ریاست اور امت کے تمام امور کو چلانے کے لیے ایک نظام اخذ ہوتا ہے اور زندگی کی تمام مشکلات کا حل نکلتا ہے۔ اگر چہ یہ نظام ایک عالمی نظام ہے تاہم اس کا طریقہ یہ نہیں کہ ابتدا ہی سے اِس کے نفاذ کے لیے عالمی سطح پر کام کیا جائے۔ بلکہ اسلام کی دعوت اگر چہ عالمی ہے لیکن اِس کے نفاذ کے لئے کام کرنے کا مرکز کسی ایک ملک یا کچھ مما لک کو بنایا جائے تا کہ وہ علاقے اس کا مرکز بنیں اور جب کسی ایک جگہ پر اسلامی ریاست وجود میں آجائے گی تو پھر وہ طبعی طور پر آگے بڑھے گی یہاں تک کہ وہ پہلے تو تمام اسلامی مما لک کو اپنے اندر ضم کرلے گی اور پھر یہ اسلامی ریاست اسلام کی دعوت کو پوری دنیا کے سامنے پیش کرے گی، اس اعتبار سے کہ اسلام پوری انسانیت کے لیے ایک عالمی اور دائمی پیغام ہے۔

یقیناً پوری دنیا اسلامی دعوت کے لئے موزوں ہے، تاہم چونکہ اسلامی مما لک کے لوگوں کا دین اسلام ہی ہے چنانچہ دعوت کی ابتداء ان مما لک سے کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح چونکہ عرب مما لک جو کہ اسلامی مما لک کا ہی حصہ ہیں، میں عربی زبان بولی جاتی ہے، وہ عربی زبان جو اسلام کا ایک لازمی جزو اور اسلامی ثقافت کا بنیادی عنصر ہے، چنانچہ دعوت کا آغاز سب سے پہلے عرب علاقوں سے کیا جائے۔ اس کے علاوہ عربی زبان کی طاقت کو اسلام کے ساتھ ملانا بھی

ضروری ہے کیونکہ دونوں کے اندر اثر کرنے، وسعت پانے اور مزید پھیلنے کی قابلیت موجود ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کا عرب ممالک میں وجود میں آنا ایک طبعی امر ہے چنانچہ یہ ریاست اس اسلامی ریاست کے لئے مرکز ہوگی جس میں تمام اسلامی علاقے شامل ہونگے۔ اگرچہ یہ بات ضروری ہے کہ عرب ممالک میں اسلام کی طرف دعوت دی جائے، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اِس اسلامی دعوت کا دائرہ کار تمام باقی اسلامی علاقوں تک بھی پھیلایا جائے۔ اِسی طرح عرب ممالک میں دعوت کی ابتداء کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اسلامی ممالک کے اسلامی ریاست میں متحد ہونے سے قبل ان میں دعوت کا کام نہ کیا جائے، بلکہ عرب ممالک میں اسلامی ریاست کو قائم کرنے کے لئے کام کیا جائے گا، پھر یہ ریاست اپنے قریبی ممالک کو اپنے اندر سموتے ہوئے وسیع تر ہوتی جائے گی، قطع نظر اس کے کہ یہ آس پاس کے ممالک عرب ہیں یا غیر عرب۔

ہم نے کہا ہے کہ نشاۃ ثانیہ کا حقیقی فلسفہ وہ آئیڈیالوجی ہے جو بیک وقت فکر اور طریقہ کا مجموعہ ہو۔ ہر اس گروہ کے لیے جس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ نشاۃ ثانیہ کے لئے کوئی قابلِ قدر کام کرے، ان دونوں یعنی فکر اور طریقہ کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

یہ اسلامی آئیڈیالوجی نہایت واضح ہو چکی ہے لہٰذا درست جماعت سازی کے لحاظ سے ایک کامل سمجھ کا حاصل کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ ایسی جماعت سازی، جو اِس آئیڈیالوجی سے اخذ کی گئی ہو، طبعی طور پر اِس فہم کے ذریعے مؤثر، تخلیقی اور آگے بڑھنے والی ہوگی۔ چنانچہ معاشرہ نہ صرف اس جماعت کو اپنائے گا بلکہ وہ اِس کی نگہداشت کرے گا اور اس کی ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر بھی اٹھائے گا، کیونکہ یہ جماعت اپنی فکر میں پختہ اور اپنے طریقے پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اپنے مقصد سے باخبر ہے۔

تاہم صرف آئیڈیالوجی کی صحیح سمجھ درست نشاۃِ ثانیہ کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اِس جماعت کے اندر موجود افراد کا موزوں ہونا اور اُن کے درمیان تعلق، جو اُنہیں آپس میں باندھے

رکھتا ہے اُس کا درست اور تعمیری (نتیجہ خیز) ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ افراد کے جماعت کا حصہ بننے کے لیے موزوں ہونے یا نہ ہونے کا تعین اس امر پر ہے کہ افراد کو جماعت کے ساتھ مربوط کرنے کا طریقۂ کار کیا ہے۔ پس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر بننے والی اس حزب کے افراد کے درمیان تعلق کا طریقہ اسلامی عقیدے کو اپنانا اور حزبی ثقافت میں پختگی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حزب کے لیے افراد کے موزوں ہونے کا تعین، دعوت کے ان افراد کے ساتھ تفاعل (interact) کرنے کے نتیجے میں، طبعی طور پر حزب کے سانچے میں اُن افراد کے ڈھل جانے سے ہوگا، نہ کہ رسمی طریقہ کار اور تنظیمی القابات سے۔

کیونکہ جو ربط و تعلق ان افراد کو ایک جماعت کی صورت میں باہم مربوط کرتا ہے وہ اسلامی عقیدہ اور اس عقیدے سے نکلنے والی حزبی ثقافت ہے۔

جب ہم گزشتہ صدی میں برپا ہونے والی تحریکوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ان کا جماعت سازی کا غلط طریقہ ان کی ناکامی کا بنیادی سبب تھا، کیونکہ وہ مذکورہ حقیقی فہم کے ساتھ حزبی بنیادوں پر قائم نہیں ہوئیں تھیں، بلکہ وہ اجتماعی بنیادوں پر یا برائے نام حزبی بنیادوں پر قائم ہوئیں تھیں۔

اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان پہلی جنگِ عظیم سے قبل یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی ایک اسلامی ریاست ہے۔ اس ریاست کی کمزوری، اس کے زوال اور اس کے بارے میں مختلف نقطۂ نظر کے باوجود اُن کی سوچ اور نظر اِسی ریاست پر مرکوز تھی۔ چنانچہ عرب اسے اپنے حقوق پامال کرنے والی اور اپنے اوپر مسلط شدہ سمجھنے کے باجود اِس اسلامی ریاست کو اپنی ریاست سمجھتے تھے اور اِس کی اصلاح کے لئے اپنی بصیرت و بصارت کے ساتھ مصروفِ عمل تھے، تاہم اہلِ عرب نشاۃِ ثانیہ کی حقیقت اور اس کے طریقہ کار کو نہیں سمجھتے تھے، اس لیے اُن میں کوئی درست جماعت سازی وقوع پزیر نہ ہوئی۔ یہی معاملہ باقی اسلامی علاقوں میں موجود مسلمانوں کا بھی تھا۔

اِس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اُس دور میں اسلامی ممالک پر بیرونی مغربی

تہذیب کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔ اسی بیرونی تہذیب کے ذریعے سے ہی استعمار مسلمانوں میں سے کچھ افراد کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا، جنہیں استعمار نے اسلامی ریاست کے اندر ایسی جماعتیں قائم کرنے پر راغب کر لیا، جن کی بنیاد اس امر پر تھی کہ اسلامی ریاست سے الگ ہو کر آزاد حکومتیں قائم کی جائیں۔ خاص طور پر استعمار کچھ عرب افراد کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا اور انہیں پیرس میں جمع کیا تا کہ انہیں عرب کی آزادی کے نام پر خلافتِ عثمانیہ کے خلاف برسرِ پیکار کیا جا سکے۔ ان افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے والی چیز یہی بیرونی ثقافت، بیرونی افکار اور وہ وطنیت اور قوم پرستی کے جذبات تھے جو کہ کافر استعمار کے پیدا کردہ تھے۔ ان افراد کے درمیان ایک ہی عقلی اور شعوری ربط و تعلق تھا اور وہ ایک ہی بات پر جمع تھے کہ جب تک عرب قوم کو آزادی نہیں ملے گی اس وقت تک خلافتِ عثمانیہ ان کے مفادات سے غفلت برتتی رہے گی، ان پر ظلم ڈھاتی رہے گی اور ان کے حقوق غصب کرتی رہے گی۔ یہی وہ واحد نصب العین تھا جس کے حصول کے لئے انہوں نے نام نہاد گروہ بنائے جو آگے چل کر ''الثورة العربية'' یعنی عرب بغاوت کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس کے نتیجے میں اسلامی ممالک خصوصاً عرب ممالک میں کفر اور استعمار کا اثر و نفوذ مضبوط و مستحکم ہو گیا۔ اِن جماعتوں کے قیام کا مقصد اِس مقام پر آ کر ختم ہو گیا اور اِن میں سے کچھ افراد کو استعماری طاقتوں کے ایجنٹوں کے طور پر اسلامی علاقوں پر حکمران مقرر کر کے اِن کی کوششوں کا صلہ دے دیا گیا۔

اسلامی ریاست کا نام و نشان مٹانے کے بعد استعمار نے اس کی جگہ لے لی۔ عرب ممالک پر تو استعمار نے براہِ راست حکومت کی اور اس نے دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اپنا اثر و نفوذ پھیلانا شروع کر دیا۔ استعمار اپنے خبیث خفیہ وسائل اور اسالیب کو بروئے کار لاتے ہوئے عرب علاقوں پر عملاً قابض ہو گیا اور اس کے ہر حصے پر اپنے قدم جما لیے۔ ان میں سے اہم ترین وسائل و اسالیب بیرونی استعماری ثقافت، مال و دولت اور اس کے ایجنٹ تھے۔

کفر اور استعمار کے قدم جمانے میں اس بیرونی ثقافت کا بہت بڑا اثر تھا۔ اسی طرح نشاۃِ ثانیہ کے حصول میں ناکامی میں اور اُن جماعتوں اور تحریکوں کی ناکامی میں بھی، جو اُمت کو

نشاۃِ ثانیہ کی طرف لے کر جانا چاہتی تھیں، اِس بیرونی ثقافت کا بہت بڑا ہاتھ ہے کیونکہ ثقافت کا انسانی فکر پر بڑا اثر ہوتا ہے، جو اس کے طرزِ حیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ استعمار نے اپنے فلسفے کی بنیاد پر تعلیمی اور ثقافتی نصاب وضع کیا، وہ فلسفہ جو زندگی کے بارے میں اس کے نقطہ نظر پر مبنی تھا اور وہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ مادہ روح سے جدا ہے اور دین ریاست سے الگ ہے۔ استعمار نے اپنی شخصیت کو اس روپ میں پیش کیا کہ گویا صرف اسی سے ہماری ثقافت نکلتی ہے۔ اس طرح اس نے اپنی تہذیب، اپنے تصورات (مفاہیم)، اپنے رہن سہن کے طریقوں، اپنی تاریخ اور اپنے ماحول کو ہمارے افکار کا بنیادی ماخذ بنا دیا۔ اس نے تو اس پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اپنی شکل وصورت کے بارے میں ہمیں ایسے مغالطے میں ڈال دیا اور اس کی شخصیت ہمارے لئے ایسی قابل اعتماد بن گئی کہ اسی سے ہمارے لئے تصورات (مفاہیم) اور حقائق نکلتے ہیں۔ اس نے اپنی استعماری صورت کو اصل کے بالکل برعکس پیش کیا، یعنی اپنے آپ کو ایسی مثالی شخصیت کے طور پر پیش کیا کہ جس کی پیروی کی جائے اور اس کے ساتھ چلے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ یہ تھے استعمار کے چھپے ہوئے خبیث چہرے کے اسالیب۔ پھر اُس نے نصاب کی تفصیلات میں دخل اندازی کی تاکہ نصاب کا کوئی ایک حصہ بھی اِس عام پالیسی کے خلاف نہ ہو۔ یوں مسلمان ایک ایسی فاسد ثقافت سے آراستۂ تعلیم کیے گئے کہ جس کی بدولت مسلمانوں نے یہ سیکھا کہ اغیار کیسے غور وفکر کرتے ہیں، چنانچہ اس ثقافت نے طبعی طور پر مسلمانوں کے اندر عاجزی اور ادنیٰ پن پیدا کر دیا اور ہم خود غور وفکر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے، کیونکہ ہماری فکر ہمارے ماحول، ہماری شخصیت اور ہماری تاریخ سے ہم آہنگ نہ رہی اور نہ ہی یہ فکر ہماری آئیڈیالوجی سے اخذ کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس ثقافت کی بدولت اپنی قوم سے اجنبی اور اپنی قوم کے حالات اور ضروریات سے بے خبر ہو گئے۔ چنانچہ اس ثقافت کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والے دانشور لوگوں کے جذبات اُن کی فکر سے جُدا ہو گئے۔ یوں یہ لوگ امت اور اُس کے جذبات واحساسات سے بھی جدا ہو گئے، چنانچہ طبعی طور پر یہ فکر امت کے حالات اور امت کی ضروریات کی درست سمجھ حاصل کرنے میں ناکام رہے گی اور نہ ہی یہ فکر نشاۃِ ثانیہ کے صحیح طریقے کو سمجھنے کے لائق ہے، کیونکہ یہ فکر اگر جذبات سے

عاری نہیں تو کم از کم جذبات سے جدا ضرور ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ مکمل طور پر ایک بیرونی فکر ہے اگرچہ اس فکر کے حامل شخص کے جذبات اسلامی ہیں۔ پس طبعی طور پر یہ فکر مذکورہ بالا درست فہم کے مطابق درست جماعت سازی کا باعث نہیں بن سکتی۔ اس بیرونی ثقافت کے اثرات صرف تعلیم یافتہ اور دانشور گروہ تک محدود نہیں رہے، بلکہ اِس بیرونی ثقافت کی وجہ سے پورے معاشرے کے افکار اِس کے جذبات سے الگ تھلگ ہوگئے۔ اس کی وجہ سے معاشرے کی مشکلات اور بھی پیچیدہ ہوگئیں، یوں ایک صحیح حزب کے لئے نشاۃِ ثانیہ کی ذمہ داری کو اٹھانے کا بوجھ پہلی جنگِ عظیم سے قبل کے مقابلے میں زیادہ بھاری ہوگیا۔ کیونکہ جنگِ عظیم اول کے بعد کام اب اِس حد تک نہیں رہا تھا کہ فقط معاشرے کی اصلاح کرنی ہے بلکہ اب دانشور گروہ کے افکار اور جذبات کے مابین نیز افراد اور معاشرے کے افکار اور جذبات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہو گی، اور اسی طرح دانشور گروہ اور معاشرے کے درمیان موافقت پیدا کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ اِن لوگوں نے اس بیرونی فکر کو بڑے خلوص سے قبول کرلیا ہے، وہ فکر جو جذبات سے عاری ہے۔ اور اس فکر کو اخلاص کے ساتھ قبول کرنے سے وہ اپنے ہی معاشرے سے وحشت زدہ ہو گئے ہیں، یہ لوگ اپنے معاشرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اپنے ہی معاشرے سے دور اور بے پرواہ ہو گئے ہیں۔ بلکہ اِس وجہ سے یہ لوگ بیرونی عناصر سے محبت کرتے ہیں، ان کا احترام اور قرب چاہتے ہیں اور انتہائی اہتمام اور توجہ سے ان سے ملاقات کرتے ہیں، خواہ یہ بیرونی عناصر استعمار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ثقافت کے حامل شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی سرزمین کی موجودہ حالات کا تصور بیرونی عناصر کی تقلید اور اُن کے حالات کے تصور کے بغیر کرے، چنانچہ وہ اپنے حالات کا ادراک نہیں کرسکتا، اس لئے اس شخص کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ امت نشاۃِ ثانیہ کی راہ پر کیسے گامزن ہوسکتی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ شخص جب اپنے حالات کی بات کرتا ہے تو اس میں بھی بیرونی لوگوں کے تصور کی تقلید کرتا ہے، جو وہ اپنے حالات کے متعلق رکھتے ہیں۔ اس فاسد ثقافت کے حامل شخص کے جذبات آئیڈیالوجی کی وجہ سے نہیں ابھرتے، بلکہ یہ صرف وطن اور قوم کی وجہ سے متحرک ہوتے ہیں جو کہ بالکل غلط بنیاد ہے۔ چنانچہ ایسا شخص کبھی بھی اپنی سرزمین

میں صحیح انقلاب برپا نہیں کرسکتا اور نہ ہی اپنی قوم کے لئے مکمل قربانی دے سکتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کا فکری ادراک حاصل نہیں کرسکتا اور نہ ہی اپنی قوم کی ضروریات کا فکری ادراک کرسکتا ہے۔ اگر بالفرض اُس کے اندر انقلاب برپا ہوتا ہے اور وہ نشاۃِ ثانیہ کا طالب بھی ہوتا ہے تو یہ انقلاب اس کے خاص مفادات کو زک پہنچنے کے نتیجے میں برپا ہوتا ہے یا یہ انقلاب دوسرے اقوام کے انقلابات کی تقلید میں برپا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی انقلابی کیفیت بہت جلد اختتام پذیر ہوجاتی ہے، پس جب اُس کے مفادات محفوظ ہوجائیں یا پھر اُس کی انانیت کو تسکین مل جائے یا پھر اگر یہ انقلاب اُس کے مفادات کے برخلاف ہو یا اُن کے لیے نقصان دہ ہو یا اس کو کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے تو تب بھی اِس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

ایسے فاسد ثقافت کے حامل افراد میں ایک صحیح جماعت سازی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک درست آئیڈیالوجیکل ثقافت یعنی اسلامی ثقافت کے ذریعے اِن افراد کی تَثقِیف (culturing) کرتے ہوئے اِن کی فکر اور جذبات کے درمیان ہم آہنگی نہ پیدا کردی جائے۔ چنانچہ تثقیف کے اِس عمل کے ذریعے علاج کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے تمام افراد کو ایک ایسا طالب علم تصور کیا جائے جن کی عقل کو ایک نئی شکل دینا درکار ہے۔ جب یہ مشکل حل ہوجائے تو اگلا مرحلہ یہ ہوگا کہ اُن افراد اور معاشرے کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے اور یوں معاشرے کی نشاۃِ ثانیہ کے مسئلے کو حل کرنا آسان ہوجائے گا۔ چنانچہ اگر بیرونی ثقافت نہ ہوتی تو معاشرے کی نشاۃِ ثانیہ کا کام موجودہ صورتِ حال کی نسبت کم مشکل ہوتا۔

اس وجہ سے معاشرے میں اس بیرونی ثقافت کے ہوتے ہوئے ایک صحیح حزبی جماعت کا وجود میں آنا محال ہے۔ اسی طرح اس بیرونی ثقافت کی بنیاد پر ایک صحیح جماعت کا نمودار ہونا بھی محال ہے۔

استعمار نے صرف اس ثقافت کے نفاذ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے اپنے سیاسی اور فلسفیانہ افکار و آرا سے بھی فضاء کو زہر آلود کردیا، جس نے مسلمانوں کے صحیح نقطۂ نظر کو بگاڑ کر رکھ

دیا، اور اسلامی فضاء کو بھی فاسد کر دیا۔ چنانچہ مسلمان زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے ذہنی الجھاؤ کا شکار ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں طبعی طور پر ان میں پائی جانے والی ذہنی بیداری اپنے اس مرکز سے محروم ہو گئی کہ جس کے گرد وہ گردش کرتی ہے۔ چنانچہ استعمار نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی ہر کوشش کو مضطرب اور متضاد کوشش میں تبدیل کر دیا جو ایسے جاندار کی حرکت کے مشابہ تھی جسے ذبح کر دیا گیا ہو، اور جو نا امیدی اور حالات کے سامنے سرنگوں ہونے کی صورت میں ٹھنڈی پڑ گئی۔ استعمار نے اس امر سے فائدہ اٹھایا کہ اس کی شخصیت زندگی کے سیاسی پہلو میں ثقافت اور راہنمائی کا مرکز بن چکی تھی۔ پس استعمار نے سیاسی لحاظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، بیرونی استعمار سے مدد مانگنے اور اسی پر بھروسہ کرنے کو اُن سیاستدانوں کا مطمعِ نظر بنا دیا جو سیاست کو ذمہ داری کی بجائے ایک پیشہ تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جماعتیں لاشعوری طور پر بھی اغیار سے مدد مانگنے کی کوشش کرنے لگیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اِن بیرونی ریاستوں سے مدد مانگ رہے تھے، یہ نہ سمجھ سکے کہ بیرونی ریاستوں سے کسی بھی قسم کی مدد مانگنے اور اس پر انحصار کرنے کو ترویج دینے کا مطلب ہے کہ وہ بیرونی زہر کا شکار ہو گئے ہیں، خواہ یہ استعماری کسی بھی ملک کے ہوں، اور ایسا کرنا امت کے ساتھ خیانت ہے، چاہے یہ حسنِ نیت ہی سے کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ اس بات کو بھی نہ سمجھ سکے کہ اپنے مسائل کو دوسروں کے پاس لے جانا سیاسی خودکشی ہے۔ چنانچہ کسی ایسی جماعت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں جس کی فکر بیرونی طاقتوں پر انحصار کرنے اور اسے ترویج دینے کے زہر سے آلودہ ہو۔

اسی طرح استعمار نے ہمارے معاشرے کو وطنیت، قومیت، اشتراکیت اور صوبائیت کی سوچ کے زہر سے آلودہ کر دیا، اور ان افکار کو نشاۃِ ثانیہ کی کسی بھی فوری کوشش کا مرکز ومحور بنا دیا۔ اِس کے ساتھ ساتھ استعمار نے اِس سوچ کے ساتھ بھی معاشرے کو زہر آلود کر دیا کہ اسلامی ریاست کا قیام اور اسلامی ممالک کی وحدت اب ناممکن ہے کیونکہ ان کے مابین تمدنی، نسلی اور لسانی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اِس حقیقت کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا کہ مسلمان سب ایک ہی امت ہیں جن کو اسلامی عقیدہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہے اور جس

سے اپنا ایک نظام نکلتا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی استعمار نے کئی اور غلط سیاسی افکار سے ہمارے معاشرے کو زہر آلود کیا جیسے کہ یہ فکر، ''جو کچھ ملے وہ لے لو اور مزید مانگو (یعنی جزوی نفاذ)'' اور مثال کے طور پر یہ کہ ''امت طاقت کا سرچشمہ ہے'' اور مثال کے طور پر یہ کہ ''حاکمیتِ اعلیٰ عوام کو حاصل ہے'' اور یہ کہ ''دین اللہ کا ہے اور وطن سب کا (یعنی ریاست اور دین کی جدائی)'' اور یہ کہ ''مصائب اور امیدیں ہمیں متحد کرتی ہیں (یعنی افکار ہمیں متحد نہیں کرتے)'' اور یہ کہ ''وطن ہی کو سب پر فوقیت حاصل ہے'' اور یہ کہ ''عزت تو وطن کے لئے ہے'' اور اس قسم کے دیگر افکار۔ اس طرح استعمار نے معاشرے کو رجعت پسندانہ اور حقیقت پرستی پر مبنی آراء سے بھی زہر آلود کیا، جیسا کہ یہ قول کہ ''ہم اپنے حالات کو دیکھ کر اپنا نظام بنائیں گے'' یا یہ کہنا کہ ''ہمیں حالات پر راضی رہنا چاہیے'' یا یوں کہنا کہ ''ہمیں حقیقت پسند ہونا چاہیے'' یا اس قسم کی اور باتیں۔

فاسد ثقافت سے زہر آلود ہونے کے باعث اسلامی ممالک بشمول عرب ممالک کے معاشرے اِس قابل نہ تھے کہ وہاں پر ایک صحیح قسم کی جماعت سازی ممکن ہوتی۔ اس لئے اِن برائے نام حزبی گروہوں کا ناکام ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں، کیونکہ یہ ایسی فکرِ عمیق کی بنیاد پر وجود میں نہیں آئے تھے، جو منظّم انداز سے قابلِ اعتماد افراد کی تیاری پر منتج ہو، بلکہ ان گروہوں کی سرے سے کوئی بنیاد تھی ہی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ ایک طبعی بات تھی کہ عالمِ اسلام خصوصاً عالمِ عرب میں قائم ہونے والی جماعتیں اپنی تشکیل کے لحاظ سے غیر مربوط ہوں کیونکہ یہ جماعتیں ایک آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی تھیں۔ اِن جماعتوں کا بغور جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اِن میں سے کچھ کا قیام بعض شدید واقعات یا مخصوص حالات کا ردِّ عمل تھا جب کہ وہ حالات ایک حزبی گروہ کے قیام کا تقاضا کرتے تھے۔ چنانچہ جب یہ حالات تبدیل ہو گئے تو یہ جماعتیں یا تو بالکل ختم ہو گئیں یا ایسی کمزور ہو گئیں کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ یا کچھ جماعتیں چند افراد کے مابین دوستی کی بنیاد پر وجود میں آئیں۔ اِسی دوستی کی وجہ سے اِن میں ہم آہنگی تھی اور یہی وہ بنیاد تھی جن پر یہ جماعتیں کھڑی تھیں، چنانچہ ان جماعتوں کا کردار ان کے گرد گھومتا ہوا ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ یا پھر اِن میں

کچھ جماعتوں کا قیام بعض افراد کے ذاتی اور شخصی مفادات کی بنیاد پر ہوا تھا۔ چنانچہ جن لوگوں نے ان بنیادوں پر، ان حالات اور معاشروں میں، ایسی جماعتوں کی بنیاد رکھی، اُن کے درمیان ایک حزبی آئیڈیالوجی کا ربط و تعلق موجود نہ تھا، اس لئے ان جماعتوں کا وجود نہ صرف نفع سے خالی تھا بلکہ یہ امت کے لئے انتہائی نقصان دہ تھیں۔ اس سے بڑھ کر معاشرے میں ان جماعتوں کا وجود ایک صحیح جماعت کے وجود کی راہ میں رکاوٹ تھا یا وہ جماعتیں اس صحیح جماعت کے وجود میں آنے میں تاخیر کا باعث بنیں، کیونکہ ان جماعتوں نے اکثریت کے ذہنوں میں مایوسی کا بیج بودیا اور عام لوگوں کو بد دِل اور شاکی بنادیا اور وہ ہر تحریک پر شک کرنے لگے خواہ وہ تحریک صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ علاوہ ازیں ان جماعتوں نے ذاتی عداوت اور خاندانی جھگڑوں کو ہوا دی اور انہوں نے اپنے اسالیب کے ذریعے لوگوں کو تذبذب میں مبتلا کردیا اور انہیں مفاد کے پیچھے بھاگنے کی تعلیم دی۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے عوام الناس کی صاف ستھری طبیعت کو بگاڑ کر رکھ دیا، یوں ان جماعتوں نے اس صحیح حزبی گروہ کی ذمہ داری کو دوچند کردیا جس کا انہی عوام الناس کے اندر سے جنم لینا انتہائی ضروری ہے۔

امت کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے اِن اسلامی، قومی اور وطنیت پر مبنی تحریکوں کے ساتھ ساتھ کچھ اشتراکی (communist) تحریکات بھی قائم ہوئیں، جو مادیت کی بنیاد پر وجود میں آئیں تھیں۔ اِن تحریکوں کا انحصار سوویت یونین کی اشتراکی تحریک پر تھا اور حقیقت میں وہی اِن کو چلا رہی تھی۔ ان کا طریقہ کار، مروجہ نظام کو نقصان پہنچانا اور تخریبی کاروائیاں کرنا تھا۔ ان کا مقصد اِن ممالک کے اندر اشتراکیت کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ مغربی استعمار کے لئے پریشانی پیدا کرنا تھا تاکہ بالآخر مشرقی بلاک کی راہ ہموار ہوسکے۔ ان تحریکات کے روحِ رواں صرف مشرقی بلاک کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ تحریکیں نہ تو امت کی ضروریات کا کوئی جواب دے سکیں اور نہ ہی اِن کا امت پر کوئی خاص اثر ہوا۔ ان کی ناکامی طبعی بات تھی، کیونکہ یہ فطرتِ انسانی کے خلاف تھیں اور اسلامی عقیدے سے متصادم تھیں۔ ان اشتراکی تحریکات نے وطنیت کے جذبات کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ان تحریکوں کی وجہ سے ان پیچیدگیوں میں مزید

اضافہ ہوگیا کہ جن کے تحت معاشرہ پہلے ہی سسکیاں لے رہا تھا۔

اس طرح کچھ گروہ اجتماع (ٹیم ورک) کی بنیاد پر وجود میں آئے، چنانچہ امت میں ایسی علاقائی اور مقامی تنظیمیں قائم ہوئیں جن کے خیراتی مقاصد تھے۔ انہوں نے تعلیمی ادارے، ہسپتال اور یتیم خانے وغیرہ قائم کیے اور خیراتی کاموں میں حصہ لیا، تاہم ان تنظیموں پر فرقہ پرستانہ تعصب کا رنگ غالب تھا۔ استعمار نے ان تنظیموں کی بھی حوصلہ افزائی کی اور ان کے خیراتی کام لوگوں کے سامنے نمایاں کیے۔ ان تنظیموں میں زیادہ تر گروہ تعلیمی اور خیراتی نوعیت کے تھے اور ان میں سیاسی نوعیت کی تنظیمیں شاذ و نادر ہی پائی جاتی تھیں۔

ان تنظیموں کے نتائج کو باریک بینی سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے امت کو کوئی فائدہ پہنچا اور نہ ہی یہ نشاۃِ ثانیہ کے سلسلے میں معاون ثابت ہوئیں۔ ان کے نقصانات اتنے ظاہر نہ تھے اور صرف اسے ہی نظر آتے ہیں جو ان کا انتہائی باریک بینی سے جائزہ لیتا ہے۔ بہرحال ان سے حاصل ہونے والے جزوی فائدے سے قطع نظر ان کا وجود ہی امت کے لئے انتہائی نقصان دہ تھا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ اسلامی افکار کی موجودگی، شرعی احکامات میں سے کچھ کا نفاذ اور اسلام سے متاثر ہونے کی وجہ سے گہرے اسلامی جذبات کی موجودگی کے سبب، امت کے اندر نشاۃِ ثانیہ حاصل کرنے کے احساسات موجود ہیں۔ اور امت کے اندر بھلائی کا رجحان اور طبعی طور پر جماعت سازی کے لئے میلان پایا جاتا ہے، کیونکہ اسلام کی روح ایک اجتماعی روح ہے۔ پس جب امت کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو یہ نشاۃِ ثانیہ حاصل کرنے کا احساس اُسے منطقی طور پر فکر کی طرف لے جائے گا، اور پھر اس فکر کے نتیجے میں امت عملی طور پر نشاۃِ ثانیہ تک پہنچ جائے گی۔ لیکن ان تنظیموں کا وجود اس راستے میں رکاوٹ ہے، کیونکہ یہ تنظیمیں ان بھڑکتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہیں اور اُن میں موجود نشاۃِ ثانیہ کے احساس کو جزوی نوعیت کے اعمال میں الجھا کر رکھ دیتی ہیں۔ چنانچہ جب کسی تنظیم کا کوئی رکن تعلیمی ادارہ تعمیر کرتا ہے یا ہسپتال بناتا ہے یا کسی اور خیراتی کام میں حصہ لیتا ہے تو اُسے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور پھر وہ اسی کام پر قناعت کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ تنظیمیں وجود میں نہ آتیں تو اسلام کی اجتماعی روح اس

شخص کوایک صحیح قسم کی جماعت سازی تک پہنچاتی، جو کہ حزبی جماعت سازی ہے، جس کے نتیجے میں صحیح نشاۃِ ثانیہ کی راہ ہموار ہو جاتی۔

ان علمی اور خیراتی تنظیموں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی تنظیمیں بھی وجود میں آئیں جو وعظ وارشاد کے ذریعے اخلاق کی بنیاد پر امت کی نشاۃِ ثانیہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے تقریروں اور لٹریچر کے ذریعے لوگوں کو اخلاقیات کی طرف بلانا شروع کیا اِس گمان کے ساتھ کہ دراصل اخلاق ہی امت کی نشاۃِ ثانیہ کی بنیاد ہیں۔ ان تنظیموں پر بے پناہ کوششیں اور اموال خرچ کئے گئے لیکن ان کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوسکا اوران کی بار بار دہرائی جانے والی باتوں نے امت کے جذبات کے ضیاع کا راستہ فراہم کیا۔ دراصل اس قسم کی تنظیموں کا قیام اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو غلط سمجھنے کا نتیجہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ ''بے شک (اے محمد ﷺ) آپ اخلاق کے بہت بڑے مرتبے پر قائم ہیں'' (القلم:4) دراصل یہاں پر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا ذاتی وصف بیان کیا ہے نہ کہ ایک معاشرے کا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی ان احادیث کو بھی غلط سمجھا گیا جن میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِىْ لِتَمَامِ مَكَارِمَ الاَخْلَاقِ)) ''بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے مکارمِ اخلاق کو پورا کرنے کے لئے بھیجا ہے'' اور فرمایا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) ''مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا'' جبکہ یہ دونوں احادیث اوران جیسی دیگر احادیث سب ایک فرد کی صفات سے متعلق ہیں نہ کہ معاشرے کی صفات سے متعلق۔ اسی طرح ان تنظیموں کو بنانے کے لئے کسی شاعر کے اس غلط قول کا بھی سہارا لیا گیا:

وَاِنَّمَا الاُمَمُ الاَخْلَاقِ مَا بَقِيَتْ
فَاِنْ هُمُ ذَهَبَتْ اَخْلَاقُهُمْ ذَهَبُوْا

یعنی جب تک اخلاق باقی ہیں تو امتیں باقی ہیں اور جب اخلاق ختم ہو جائیں تو امتیں بھی فنا ہو جاتی ہیں۔

ان تنظیموں نے اس بات کو سمجھنے میں غلطی کی کہ امتوں کے دوام و بقا کا دارومدار ان کے

اخلاق پر نہیں بلکہ ان کے اپنائے ہوئے عقائد، ان کے اختیار کیے ہوئے افکار اور ان کے نافذ کیے ہوئے نظاموں پر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ تنظیمیں معاشرے کی حقیقت کا غلط فہم رکھتی تھیں کہ معاشرہ افراد کا مجموعہ ہوتا ہے جبکہ دراصل معاشرہ ان اجزاء سے مل کر بنتا ہے: افراد، اُن کے افکار، اُن کے جذبات اور اُن پر نافذ نظام۔ چنانچہ معاشرے کا بگڑ جانا اس معاشرے میں موجود افراد کے افکار، اُن کے جذبات اور اُن پر نافذ نظاموں کے بگڑ جانے کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ فقط افراد کے بگڑ جانے سے۔ نتیجتاً معاشرے کی اصلاح بھی اُس معاشرے میں موجود لوگوں کے افکار، اُن کے جذبات اور اُن پر نافذ نظام کی اصلاح سے ہی ممکن ہوتی ہے۔

ان کے اس غلط فہم کی وجہ وہ غلط سوچ بھی تھی جو بہت سے اصلاح پسندوں اور علمائے اخلاق کے ذہنوں میں پیوست ہو چکی ہے کہ گمراہ افراد ہی کسی معاشرے کے بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ اس سوچ کے مطابق اخلاق ہی ایک فرد کو تعمیر کرتے ہیں یا تباہ کرتے ہیں۔ پس اچھے اخلاق انسان کو استقامت والا، فعّال، پرُ جوش، بھلائی اور اصلاح کے کام کرنے والا بناتے ہیں۔ جبکہ بُرے اخلاق اس کو کمزور، ڈھیلا ڈھالا، بے فائدہ، ہر خیر سے خالی، خواہشاتِ نفس کا پیروکار اور اَنا پرست بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ تنظیمیں سمجھتی تھیں کہ معاشرے کی اصلاح فرد کی اصلاح سے ہی ہوتی ہے لہٰذا انہوں نے اخلاقیات سے معاشرے کی اصلاح کا ارادہ کیا تا کہ امت اخلاق کے ذریعے نشاۃِ ثانیہ کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

اگر چہ وہ تمام اصلاحی تحریکیں ناکامی سے دوچار ہوئیں جن کی بنیاد اس اخلاقی قاعدے پر رکھی گئی تھی مگر بہت سے لوگ پھر بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ قاعدہ معاشرے کی اصلاح کی بنیاد ہے۔ چنانچہ اس بنیاد پر اور اصلاحی تنظیمیں بنائی گئیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر چہ فرد معاشرے کا جزو ہے لیکن معاشرے کی اصلاح کے وسائل فرد کی اصلاح کے وسائل سے الگ ہیں، کیونکہ معاشرے کا بگاڑ اجتماعی جذبات اور فکری وروحانی ماحول کے بگڑ جانے کا نتیجہ ہے، علاوہ ازیں معاشرے میں بگاڑ کی وجہ معاشرے میں غلط تصورات (مفاہیم) کا وجود پزیر ہونا ہے۔ دوسرے لفظوں میں معاشرے کا بگاڑ عرفِ عام کے بگاڑ کی وجہ سے ہے، چنانچہ اس کی اصلاح بھی

صحیح عرف عام پیدا کیے بغیر ممکن نہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ معاشرے کی اصلاح اجتماعی جذبات، صحیح روحانی ماحول اور صحیح فکری ماحول جو روحانی پہلو سے متصل ہو، پیدا کیے بغیر اور ریاست کی جانب سے نظام کو نافذ کئے بغیر ممکن نہیں۔ یہ سب صرف اُس وقت ممکن ہے جب ایک اسلامی ماحول پیدا کر دیا جائے اور عوام الناس کے تصورات (مفاہیم) کو درست کر دیا جائے، چنانچہ اِس طرح معاشرے کی اصلاح ہوگی جو پھر ایک فرد کی اصلاح کا باعث بنے گی۔ چنانچہ معاشرے کی اصلاح نہ تو اجتماعی ٹیم ورک کی بنیاد پر جماعتیں بنانے سے ہوگی اور نہ ہی اخلاقی اور وعظ وارشاد کی بنیاد پر جماعتیں بنانے سے ہوگی۔

چنانچہ اِن بنیادوں پر قائم جماعتیں معاشرے میں کسی قسم کی اصلاح یا نشاۃِ ثانیہ پیدا کرنے میں ناکام ہوگئیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ جماعتیں جو ایک خاص آئیڈیالوجی کی بجائے برائے نام حزبی بنیادوں پر قائم ہوئی تھیں وہ بھی ناکامی سے دوچار ہوگئیں۔ کیونکہ انہوں نہ تو کسی متعین مبدا کو اختیار کیا تھا اور نہ ہی انہوں نے پہلے سے آئیڈیالوجی کا صحیح فہم حاصل کیا تھا اور نہ ہی وہ جماعتیں اپنے ممبران کے درمیان ایک آئیڈیالوجی کی بنیاد پر جامع اور درست ربط و تعلق قائم کرسکی تھیں۔

اِن جماعتوں کا ممبر شپ کا غلط طریقہ بھی ان جماعتوں کے ناکام ہونے کی ایک لازمی وجہ تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ جماعتیں صحیح تکتلی بنیادوں پر قائم نہیں ہوئیں تھیں اور ان کے پاس کوئی فکر اور طریقہ موجود نہ تھا، دوسری طرف ان کی جماعت سازی میں افراد کے اس جماعت کے لیے موزوں ہونے کو مدِّنظر نہیں رکھا گیا، بلکہ یہ اس بنیاد پر قائم کی گئی تھیں کہ معاشرے میں اُن افراد کا مقام و مرتبہ کیا ہے اور اس تنظیم یا جماعت میں اُن کی موجودگی سے کیا فوائد حاصل ہوں گے۔

چنانچہ ان جماعتوں کی رکنیت کے لئے افراد کو اس بنیاد پر منتخب کیا جاتا تھا کہ ایک فرد اپنی قوم میں کس قدر شہرت رکھتا ہے یا پھر کس قدر مالدار ہے۔ یا پھر وہ وکیل یا ڈاکٹر جیسی بااثر حیثیت کا

حامل ہے، قطع نظر یہ کہ وہ اس جماعت کے لیے اہل ہے یا نہیں۔ اس لئے ان گروہوں کے افراد کے درمیان ہم آہنگی کا فقدان اور طبقہ واریت کا غلبہ رہتا تھا۔ ان احزاب اور تنظیموں کے افراد کے اندر یہ مخفی جذبات بھی پائے جاتے تھے کہ وہ باقی لوگوں سے نہ صرف مال و جاہ کے لحاظ سے بلکہ ایک حزب یا تنظیم کا رکن ہونے کے لحاظ سے بھی ممتاز ہیں۔ اس لئے ان کے اور عوام الناس کے درمیان کوئی ہم آہنگی اور قرب پیدا نہیں ہو سکا۔ اس لئے ان تنظیموں یا احزاب کا وجود مصیبت بالائے مصیبت اور معاشرے کی مشکلات میں مزید اضافہ تھا جن کے نیچے معاشرہ پہلے ہی سسکیاں لے رہا تھا۔

لہٰذا تمام جماعتوں اور گروہوں کے اس مطالعہ، غور و فکر اور چھان بین کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ صدی کے دوران تمام اسلامی ممالک میں کوئی ایسی صحیح جماعت وجود میں نہیں آئی جو امت کو نشاۃِ ثانیہ کی راہ پر گامزن کر سکتی۔ یہ تمام گروہ غلط بنیادوں پر قائم ہونے کی وجہ سے ناکامی سے دوچار ہوئے، جبکہ یہ حقیقت ہے کہ امت ایک جماعت کی موجودگی کے بغیر نشاۃِ ثانیہ حاصل نہیں کر سکتی۔ پھر وہ کون سی صحیح جماعت ہے جو امت کی نشاۃِ ثانیہ کا سبب بن سکتی ہے؟ اس امر کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

وہ صحیح جماعت جس کے ذریعے امت نشاۃِ ثانیہ حاصل کر سکتی ہے اسے اجتماعی بنیادوں پر قائم نہیں کیا جا سکتا، جو اپنے لوگوں کو چند اعمال کو سرانجام دینے یا باتوں کو بیان کرنے یا دونوں کی بنیاد پر اکٹھا کریں۔ چنانچہ ایسی امت میں جو نشاۃِ ثانیہ کی خواہشمند ہے اِس قسم کی جماعتوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔ اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ وہ ایسی جماعت ہو جو ایک آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قائم نہ ہوئی ہو، جیسا کہ پہلی جنگِ عظیم سے لے کر اب تک اسلامی دنیا میں ہوا ہے۔

صحیح جماعت صرف وہ حزب ہے جو اسلام کی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قائم ہو۔ آئیڈیالوجی کی فکر ہی اس جماعت کی روح ہو، یہی اس کا بنیادی بیج اور اس کی زندگی کا راز ہو۔ اس کا پہلا خلیہ وہ انسان ہو جس میں وہ فکر اور اس فکر کی جنس کا طریقہ مکمل طور پر سما جائے، یہاں تک کہ

وہ انسان اپنی صفائی وستھرائی میں اس فکر کی مانند ہو جائے اور وضاحت واستقامت میں اس طریقے کی طرح ہو جائے۔ جب یہ تین چیزیں پائی جائیں گی یعنی عمیق فکر (فکرۃ)، واضح طریقہ اور صاف ستھرا انسان تو پہلا خلیہ وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ خلیہ دوسرے خلیوں کو بناتا چلا جاتا ہے۔ یوں حزب کا پہلا حلقہ یا ''حزب کی قیادت'' وجود میں آتی ہے۔ جب پہلا حلقہ وجود میں آتا ہے تو حزبی گروہ (کُتلَه الحِزبِیه) وجود میں آنا شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ حلقہ ایک گروہ کی شکل اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔ اب یہ گروہ ایک حزبی ربط وتعلق کا محتاج ہوتا ہے جو اُن لوگوں کو، جنہوں نے اس فکر اور طریقے کو اپنا لیا ہے، آپس میں مربوط کر دے۔ یہ حزبی رابطہ وہ عقیدہ ہے جس سے حزب کا بنیادی فلسفہ اور وہ ثقافت نکلتی ہے کہ جو حزب کے مفاہیم کو خاص وصف دیتی ہے۔ اس طرح حزبی گروہ وجود میں آ کر کارزارِ حیات میں چل پڑتا ہے۔ اِس دوران اِس گروہ کو گرم وسرد موسم، تند وتیز ہواؤں اور صاف وگرد آلود فضاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس جب یہ حزبی گروہ ان عوامل کا سامنا کرتا ہے تب اس کی فکر شفاف اور اس کا طریقہ واضح ہو جاتا ہے اور یہ گروہ اپنے ممبران کو تیار کرنے اور گروہ کے درمیان ربط وتعلق کو مضبوط بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور یہ گروہ اِس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ دعوت کے میدان میں عملی قدم اٹھائے اور ایک کتلہ سے ایک مکمل آئیڈیالوجیکل حزب میں تبدیل ہو جائے، جو درست نشاۃِ ثانیہ کے لیے سرگرم ہو۔ یہ ہے وہ صحیح جماعت کہ فکر (فکرۃ) جس کا بیج ہوتی ہے اور یہی فکر اِس کی زندگی کا راز ہوتی ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ آئیڈیالوجیکل جماعت اُس امت کے اندر طبعی طور پر کیسے اُبھرتی ہے، جو نشاۃِ ثانیہ کی خواہش مند ہو، تو اس کی تفصیل ذیل میں ہے:

امت ایک ایسا جسدِ واحد ہے جس کے اجزاء علیحدہ نہیں ہو سکتے، چنانچہ یہ امت اپنی بناوٹ میں ایک انسان کی مانند ہے۔ چنانچہ اگر ایک انسان کسی ایسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جائے کہ وہ موت کے کنارے پر پہنچ جائے، تو جب ایسے انسان کے اندر زندگی کی رمق پیدا ہوتی ہے تو یہ اس کے پورے بدن میں رفتہ رفتہ، اس کے ایک ہی جسم ہونے کے ناطے، اکٹھے واپس لوٹتی ہے۔ بالکل اسی طرح انحطاط کی شکار امت گویا ایک بیمار جسم ہے۔ جب اس میں زندگی کی لہر پیدا

ہوگی تو اس کے پورے جسم میں اس کے ایک ہی جسد ہونے کی ناطے اکٹھی واپس آئے گی۔ امت کی زندگی وہ فکر ہے جس کے ساتھ اس کا ہم جنس طریقہ بھی ہو، تا کہ وہ اس فکر کو نافذ کر سکے۔ فکر اور طریقہ کا مجموعہ آئیڈیالوجی کو تشکیل دیتا ہے۔

امت کے اندر دوبارہ زندگی کی روح پھونکنے کے لئے صرف آئیڈیالوجی کا وجود کافی نہیں بلکہ جب امت اس آئیڈیالوجی سے ہدایت حاصل کرے اور زندگی کے معاملات میں اِسے بروئے کار لائے، تبھی امت کے اندر زندگی واپس آ سکے گی۔ ایسا ہوتا ہے کہ امت کے پاس آئیڈیالوجی قانونی، ثقافتی اور تاریخی ورثے کے طور پر تو موجود ہوتی ہے لیکن امت اس سے غافل ہوتی ہے یا اس کے فکر اور طریقہ سے یا پھر ان دونوں کے آپس کے تعلق سے بے خبر ہوتی ہے۔ اس صورت میں صرف فکر اور طریقہ کا پایا جانا نشاۃِ ثانیہ کی طرف لے جانے کے لیے کافی نہیں۔

امت میں عادتاً اس وقت زندگی کی لہر پیدا ہوتی ہے جب معاشرے میں سخت جھٹکے لگیں جس کے نتیجے میں معاشرے میں ایک مشترکہ احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ اجتماعی احساس فکری عمل کا سبب بنتا ہے جس کے نتیجے میں ان جھٹکوں کے اسباب واثرات اور امت کو اِن سے محفوظ رکھنے کے فوری اور طویل المدتی ذریعوں کے حوالے سے بحث وتمحیص کے بعد کچھ وجوہات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یہ احساس اگرچہ معاشرے کے افراد کے درمیان مشترک ہوتا ہے لیکن یہ لوگوں کے درمیان ان کی استعداد اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیت کی بنا پر مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے فکر (فکرۃ) سے رہنمائی حاصل کرنے کا خیال ،جو امت کے اندر خوابیدہ حالت میں موجود ہوتا ہے، جمع ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ یہ اعلیٰ درجے کے احساس کے حامل افراد میں مرتکز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ خیال اُنہیں بیدار کرتا ہے، انہیں متاثر کرتا ہے اور انہیں عمل کے لیے متحرک کرتا ہے۔ پس اِن لوگوں میں زندگی کی علامات سب سے پہلے ظاہر ہوتی ہیں۔

چنانچہ یہ لوگ جو اعلیٰ درجے کا احساس رکھتے ہیں، معاشرے کے احساسات کا عکس

ہوتے ہیں۔ اور چونکہ فکر اُن کے اندر مرتکز ہوجاتی ہے پس وہ مکمل آگاہی اور فہم کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ یہ لوگ امت کی آنکھوں کی مانند ہیں اور امت کا بیدار گروہ ہیں۔

لیکن شروع میں یہ بیدار گروہ حیران و پریشان ہوتا ہے، کیونکہ یہ اپنے سامنے کئی راستے دیکھتا ہے اور متحیر ہوتا ہے کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرے۔ پھر اس گروہ کے اراکین کے اندر بھی بیداری کا درجہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ اِن میں سے بعض میں 'منطقِ احساس' باقیوں سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس گروہ میں سے ایک ممتاز اور منفرد طبقہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو مطالعے اور باریک بینی سے جائزے کے بعد، ان راستوں میں سے ایک راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ جس طرح یہ گروہ اُس راستے کے بارے میں بصیرت حاصل کرتا ہے جس راستے پر اُسے چل کر جانا ہے، اُسی طرح وہ اپنی اس منزل کا بھی ادراک کرتا ہے کہ جس کی طرف یہ راستہ لے کر جائے گا۔ چنانچہ یہ گروہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہوجاتا ہے۔ اور یوں یہ گروہ آئیڈیالوجی تک پہنچ جاتا ہے، جو فکر (فکرۃ) اور طریقہ پر مشتمل ہوتی ہے، اور وہ اس آئیڈیالوجی کو ایک راسخ عقیدے کی طرح اختیار کر لیتا ہے۔ یہ عقیدہ اور حزبی ثقافت ہی اس گروہ کے افراد کے مابین وہ رابطہ بنتی ہے کہ جو انہیں باہم مربوط کرتا ہے۔

جب یہ آئیڈیالوجی اس گروہ کے لوگوں میں مجسم ہوجاتی ہے تو یہ ان کے اندر محبوس ہو کر نہیں رہتی بلکہ یہ انہیں اس آئیڈیالوجی کی دعوت دوسروں تک پہنچانے پر مجبور کرتی ہے۔ پھر ان کے اعمال اِس آئیڈیالوجی کے مطابق ہونگے اور وہ اس آئیڈیالوجی کے منہج کے مطابق قدم بڑھائیں گے اور اس آئیڈیالوجی کی حدود و قیود کی پابندی کریں گے۔ ان اشخاص کا وجود ہی اس آئیڈیالوجی اور اس کی طرف دعوت کے لئے ہے اور اس کے لیے درکار امور کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ اس دعوت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ صرف اور صرف اس آئیڈیالوجی کو ہی اختیار کریں اور اس کے بارے میں عام بیداری (وَعِیَ الْعَام Public Awareness) پیدا ہوجائے۔ یوں یہ پہلا حلقہ ایک گروہ میں تبدیل ہوتا ہے، پھر یہ گروہ ایک ایسی آئیڈیالوجیکل حزب میں تبدیل ہوجاتا ہے، جو طبعی طور پر دو پہلوؤں سے آگے بڑھتی ہے: ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ

دوسرے ایسے خلیوں کو پیدا کر کے اپنے خلیوں میں اضافہ کرے گا جو اس آئیڈیالوجی کو انتہائی بیداری اور ادراک سے اپنائیں گے، جبکہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ پوری امت کے اندر اِس آئیڈیالوجی کے حق میں عام بیداری پیدا کی جائے۔ یوں آئیڈیالوجی کے بارے میں اس عام بیداری کے نتیجے میں مکمل امت میں نہ سہی لیکن اُس کی اکثریت کے اندر افکار، آراء اور اعتقادات کی وحدت پیدا کی جائے گی۔ اس طرح امت کا ہدف، امت کے پختہ تصورات اور زندگی کے بارے میں امت کا نقطۂ نظر ایک ہوجائے گا۔ یوں حزب ایک کٹھالی بن جائے گی جس میں امت پگھل کر ان گندگیوں اور مفاسد سے پاک ہو جائے گی جو اس کے انحطاط کا سبب بنے یا دورِ انحطاط میں اس کے اندر سرایت کر گئے۔ حزب ہی کو امت کی صفائی کے اس کام کی نگرانی کرنی چاہیے اور یہی عمل نشاۃِ ثانیہ کا سبب بنے گا۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے، اس لئے یہ کام صرف وہ حزب کر سکتی ہے جو اپنی فکر میں ڈھل چکی ہو، اپنی زندگی کو اس فکر کے لیے وقف کر چکی ہو اور اپنے ہر قدم کا ادراک بھی رکھتی ہو۔

اس کا سبب یہ ہے کہ یہ احساس ہی ہے جو حزب کو فکر کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ فکر امت میں موجود مختلف قسم کے افکار کی نسبت زیادہ روشن اور نمایاں ہوگی۔ ابتدا میں حزب کی یہ فکر دوسرے افکار کی طرح فقط ایک فکر ہوتی ہے۔ اور شروع میں تو یہ سب سے کمزور فکر ہوتی ہے کیونکہ یہ ان سب افکار میں نوخیز ہوتی ہے اور اِس کی جڑیں امت میں گہری نہیں ہوتیں۔ اور نہ ہی ابھی یہ فکر اپنے لئے ایک فضاء تیار کر پاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ 'منطقِ احساس' کا نتیجہ ہے یعنی یہ ایسا فہم ہے جو حِسی ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے لہٰذا یہ فکری احساس ہوتا ہے یعنی ایسا واضح احساس جو گہری فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ طبعی طور پر ہر اس شخص کو پاک صاف کرتا ہے جس کے اندر سموتا ہے اور اس کو مخلص بنا کر چھوڑتا ہے، اگر وہ مخلص نہ بھی بننا چاہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ فکر ایک مخلص شخص کے اندر عقیدہ اور ثقافت کی حیثیت سے مجسم ہو جاتی ہے، پھر یہ اس شخص کے اندر زبردست انقلاب پیدا کرتی ہے۔ یہ انقلاب ایک ایسا لاوہ ہے جو جذبات اور فکر کے آپس میں ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے جو دعوت میں ولولے، سچائی اور جوش وخروش کو جلا بخشے گا، اِس کے ساتھ ساتھ یہ دعوت

کے اندر منطق اور فکر کو نکھارے گا اور ایک آگ بن جائے گا جو کرپشن کو جلا ڈالے گی اور ایک نور ہو گا جو اصلاح کے راستے کو روشن کرے گا۔ اس طرح یہ دعوت فاسد افکار، رُو بہ زوال عقائد اور متعفن عادات کے ساتھ کشمکش میں داخل ہو جائے گی اور وہ اپنے دفاع کی کوشش کریں گے، لیکن ان کا دفاع صرف یہ ہو گا کہ وہ اس نئی آئیڈیالوجی سے ٹکرائیں گے جس سے یہ آئیڈیالوجی مزید مضبوط ہو گی۔ یہ کشمکش اُس وقت تک رہے گی جب تک کہ تمام افکار و عقائد اپنی طاقت کھو دیں اور صرف حزب کی آئیڈیالوجی اِس امت کے اندر اِس امت کی فکر اور عقیدہ کے طور پر باقی رہ جائے۔

جب ایک بار حزب نے امت کے افکار، پختہ تصورات اور آراء کو متحد کر لیا تو اس نے امت میں بصیرت افروز انداز سے وحدت پیدا کر دی۔ گویا امت کو امتِ واحدہ میں ڈھالنے کے لیے حزب نے امت کو پگھلایا اور اُسے صاف شفاف کر دیا۔ اور یوں صحیح وحدت وجود میں آ گئی۔

اس کے بعد حزب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس میں حزب انقلابی اصلاح کے کام میں امت کی قیادت کرتی ہے، تاکہ امت نشاۃِ ثانیہ کی راہ پر گامزن ہو، پھر یہ امت کو ساتھ لے کر اسلام کے پیغام کو دوسری اقوام اور امتوں تک پہنچائے تاکہ انسانیت کے حوالے سے اپنے اوپر عائد ہونے والے فریضہ سے عہد برآ ہو سکے۔

اِس حزبی گروہ کا اجتماعی تحریک ہونا لازمی ہے اور اس کے اجتماعی تحریک نہ ہونے کی کوئی گنجائش بھی نہیں کیونکہ ایک صحیح جماعت کبھی بھی انفرادی تحریک نہیں ہوتی۔ اس لیے اسلامی ممالک میں حزب کے ذمہ داروں پر لازم ہے کہ وہ اجتماعی تحریکوں کے بارے میں باریک بینی سے بحث و تحقیق کریں اور ان کے متعلق گہرا فہم حاصل کریں۔

جب ہم ان اجتماعی تحریکوں کا مطالعہ کرتے ہیں، جنہوں نے اپنے دور میں اپنے ماحول کو بہت متاثر کیا تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں ایسے حالات میں برپا نہیں ہوئیں جب ہر طرف آسودگی ہو، انسان کے طبعی حقوق میسر ہوں، بے پناہ خوشحالی ہو اور شخصی قابلیت ہی اہم امور کو

سوچنے کے لیے معیار ہو۔ اجتماعی تحریکوں کے متعلق یہ فہم حاصل کر کے ہم ہر تحریک کو عادلانہ ترازو میں تول سکتے ہیں کہ وہ ماحول اور حالات کیا تھے جن میں یہ تحریکیں تھیں یا ہیں اور ان تحریکوں کو چلانے میں باخبر افراد کو کس قدر عمل دخل حاصل تھا، اور وہ کس حد تک اس کام پر قدرت رکھتے تھے اور اپنے راستے میں حائل روکاوٹوں کو دور کرنے پر کہاں تک قادر تھے۔

ان تحریکوں کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حکمران ٹولے نے یا موجودہ نظام نے اپنے مفادات وخواہشات کے مطابق اِن کی آئیڈیالوجی سے ساز باز کرنے یا اُسے کچلنے کی کوشش کی تو یہ لوگوں کے اندران کے خلاف کس قدر ناپسندیدگی اور ناگواری پیدا کر سکیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ان اجتماعی تحریکوں کو سمجھنا ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم معاشرے میں زندگی کا مطالعہ کریں۔ نیز یہ اِس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ امت کے حکمرانوں اور حکمرانوں کے امت کے ساتھ تعلقات اور اُس بنیاد کو بھی جن پر یہ تعلقات استوار ہیں، سمجھ لیں۔ ہمارے لیے معاشرے میں غالب آراء وافکار اور ان کے بارے میں اسلام کے احکامات کا تقابلی جائزہ بھی لازمی ہے اور اِن دونوں کے درمیان کسی بھی عدم مطابقت کا احاطہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عدم مطابقت بنیاد میں تغیر وتبدیلی کی وجہ سے ہے یا فروع میں اور کیا اسلام اِس تغیر وتبدیلی کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ اس طرح ان اجتماعی تحریکوں کے مطالعے کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہم امت کے احساسات کا مطالعہ کریں جو اِس بات کو دیکھ رہی ہے کہ اسلام کی آراء، افکار اور احکامات اُس کی زندگی سے مٹتے چلے جارہے ہیں جس کی اصل وجہ یہ حکمران ہیں اور وہ ایسا بزور شمشیر، مکر وفریب اور مال ودولت کے بل بوتے پر کر رہے ہیں۔

ان تحریکوں کو سمجھنے کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہم امت کے عمومی میلان کو جانیں اور امت پر زبردستی نافذ کیے جانے والے نظام کی طرف امت کے نقطہ نظر کو سمجھیں۔ یہ تمام غیر اسلامی نظام حقیقت میں اسلام کو معاشرے سے نکال باہر کرنے کے درپے ہیں اور انہوں نے امت کو زوال

اور ناکامی و نامرادی میں دھکیل دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امت میں موجود مفکرین کے رجحانات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اور یہ دیکھنا بھی کہ وہ کس حد تک اس مسلط کردہ فاسد نظام کو قبول کر رہے ہیں یا پھر اِسے مسترد کر رہے ہیں، اس طرح اس بات کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس نظام کی جانب سے دی جانے والی دھمکیوں اور لالچ سے کس حد تک متاثر ہو رہے ہیں۔

مزید برآں اس حزبی گروہ کو اپنے آپ کو پہچاننا اِس لحاظ سے ضروری ہے کہ وہ اِس کے ذریعے اِس بات کو یقینی بنائے گا کہ اُس کا تیز احساس، عمیق فکر اور خالص اخلاص قائم رہے۔ اِس حزبی گروہ کو اس بات کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ معاشرے میں ہونے والے واقعات اسلام اور اسلامی قوانین پر اِس کے ایمان کو کمزور نہ کرسکیں، اسی طرح کسی قسم کا لالچ، دھمکی، تشدد، سہولتیں اور آزمائشیں اسے متاثر نہ کریں۔ پھر اس گروہ کو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ یہ اعلیٰ اقدار کا حامل ہو اور اپنے ایمان کا مکمل محافظ ہو۔ اسی طرح اِس گروہ کے اندر گہرے اسلامی افکار کا راسخ ہونا، اِس گروہ کا عوامی مفادات کو اختیار کرنا اور اپنی ذمہ داری کا احساس، اِن تمام معاملات میں کاملیت ہونی چاہیے۔ اور اِس گروہ کو اس بات کو بھی یقینی بنانا چاہیے کہ کسی سمجھوتے اور خلاف ورزی کے بغیر اس کی آئیڈیالوجی محفوظ ہو خواہ اسے کتنے ہی تشدد، ظلم و جور، سختی اور خوف و خطر کا سامنا ہو۔ اور یہ گروہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہو کہ اس نے یہ مصمم ارادہ کیا ہے کہ وہ تمام تر نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس ذمہ داری کو اٹھانے پر کمر بستہ ہو چکا ہے۔

اجتماعی تحریکوں کے بارے میں یہ تاریخی اور واقعاتی(factual) مطالعہ، ایک آئیڈیالوجیکل حزب کے ایک اجتماعی تحریک ہونے کی حیثیت سے، اعمال کی انجام دہی کی حقیقت کو سمجھنے میں اس کی راہنمائی کرسکتا ہے۔ حزب کو اِس بات کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ وہ اپنی شرائط کو پورا کرتی ہو اور اپنے طبعی راستے پر آگے بڑھ رہی ہو۔ اگر حزب کو اپنی کارگزاری میں کوئی خامی نظر آئے یا پھر تدریس سے معلوم ہو کہ اسے اپنے اعمال میں لچک کی ضرورت ہے یا پھر حزب کے ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت ہو یا پھر یہ محسوس ہو کہ اسے اپنی جدوجہد میں مزید سختی کی ضرورت ہے، تب اس حزب کو چاہیے کہ وہ ایسے اسالیب اختیار کرے جو اِس بات کو یقینی بنائیں کہ حزب

اپنے نشاۃِ ثانیہ کے پیغام کوامت تک کامیابی سے پہنچا سکے اور پھر امت کووہ اتھارٹی دلا سکے کہ جس سے اس پیغام کودوسری امتوں اور قوموں تک پہنچانے کے سلسلے میں امت پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، امت اس سے عہدہ برآ ہو سکے۔

ایک حزب صحیح جماعت سازی کے لحاظ سے مندرجہ ذیل طریقے سے آگے بڑھتی ہے:

1) ایک بلند فکر اور اعلیٰ احساس والا شخص جب آئیڈیالوجی تک پہنچتا ہے اور وہ آئیڈیالوجی اس سے تفاعل کرتی ہے، یہاں تک کہ یہ آئیڈیالوجی اس شخص کے لیے انتہائی صاف شفاف اور واضح ہو جاتی ہے، تب حقیقتاً پہلا خلیہ وجود میں آجاتا ہے۔ یہ خلیہ کثیر تعداد میں بڑھنا شروع ہو جاتا ہے لیکن اِس کی رفتار سُست ہوتی ہے۔ لیکن اِس کے باوجود کئی دوسرے افراد اس کے ساتھ شامل ہوجانے سے کئی دوسرے خلیے وجود میں آتے ہیں اور یہ سب افراد صرف اور صرف آئیڈیالوجی کی بنیاد پر آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔ یوں ان افراد سے اس حزبی گروہ کا پہلا حلقہ یا دوسرے الفاظ میں ''حزب کی قیادت'' وجود میں آتی ہے۔ ان افراد کے درمیان جماعت سازی کے لیے صرف اور صرف آئیڈیالوجی کا بطورِ محور ہونا انتہائی ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ آئیڈیالوجی ہی ان سب کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے کشش ثقل بنے۔

2) ابتداء میں یہ پہلا حلقہ طبعی طور پر تعداد کے لحاظ سے کم اور حرکت کے لحاظ سے سست رفتار ہوتا ہے کیونکہ اگر چہ یہ پہلا حلقہ یا دوسرے لفظوں میں حزبی قیادت اس معاشرے کے احساس کا اظہار ہوتی ہے جس میں یہ خود رہتی ہے لیکن یہ قیادت جن الفاظ اور معانی کے ذریعے اس احساس کا اظہار کرتی ہے وہ ان الفاظ اور معانی سے مختلف ہیں جن کا معاشرہ عادی ہو چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر چہ اس قیادت کے تصورات نئے ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں رائج تصورات سے مختلف ہونگے، تاہم یہ قیادت معاشرے کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ پس یہ حلقہ معاشرے میں اجنبی ہوتا ہے اور شروع شروع میں اس کی طرف صرف وہ لوگ آتے ہیں جن کے اندر احساس اس حد تک قوی ہو کہ حلقہ اولیٰ میں پائے جانے والی آئیڈیالوجی کی مقناطیسی کشش کی

طرف کھچے آنے کے لئے ان کے اندر قابلیت پہلے ہی موجود ہو۔

3) اس پہلے حلقے یعنی ''قیادت'' کی فکر عادتاً بہت عمیق ہوتی ہے اور نشاۃِ ثانیہ کے بارے میں اس کا طریقہ بنیادی ہوتا ہے یعنی وہ بالکل بنیاد سے کام شروع کرتا ہے۔ اس لئے یہ حلقہ اولیٰ ان ناگفتہ بہ حالات جن میں امت زندگی گزار رہی ہوتی ہے، سے بلند ہوکر اونچی فضاؤں میں پرواز کرتا رہتا ہے اور اس صورتِ حال کو بھی دیکھ رہا ہوتا ہے جس کی طرف یہ امت کو منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح تبدیلی کے طریقے پر بھی اس کی واضح طور پر نظر ہوتی ہے جس پر اسے موجودہ حالات کو بدلنے کے لئے چلنا ہوگا۔ پس وہ ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو نظر سے اوجھل ہوتی ہیں کیونکہ معاشرے کی اکثریت، کہ جہاں یہ حلقہ موجود ہوتا ہے، صرف اسی کو دیکھ پاتی ہے جو ان کی نظروں کے سامنے ہو۔ اِس لیے لوگوں کا اپنے حالات سے جڑے رہنے کی وجہ سے بلند فضاؤں میں پرواز کرنا بہت مشکل ہے، چنانچہ اُن کے لئے موجودہ حالات کی تبدیلی کا صحیح ادراک بھی دشوار ہوتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ زوال کے شکار معاشرے کی فکر پست ہوتی ہے اور ایسا معاشرہ ہر معاملے کو حقیقت سے ہی اخذ کرتا ہے، پھر دیگر اشیاء کو اس پر عمومی انداز میں غلط قیاس کرتا ہے اور اپنے آپ کو حقیقت ہی کے مطابق ڈھالتا ہے، پس اس کے مفادات حقیقت ہی سے مطابقت رکھتے ہیں۔

جبکہ حزبی حلقہ اولیٰ اپنی فکر کے لحاظ سے پست فکر سے نکل کر کُلی فکر کے راستے پر گامزن ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موجودہ حقیقت کو اپنی فکر کا مصدر نہیں بناتا اور نہ ہی آئیڈیالوجی کو حقیقت کے مطابق چلاتا ہے بلکہ وہ موجودہ حقیقت کو اس حیثیت سے اپنی فکر کا موضوع بناتا ہے کہ وہ اِس حقیقت کو آئیڈیالوجی کے موافق بدل دے، اس لئے وہ حقیقت کو بدلنے اور اسے اپنے ارادوں کے سامنے سرنگوں کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ حقیقت اس آئیڈیالوجی کے گرد گردش کرے، جس کا یہ حامل ہے، نہ کہ آئیڈیالوجی موجودہ حقیقت کے گرد گردش کرے۔ یوں اس حلقۂ اولیٰ اور معاشرے کے درمیان زندگی کے متعلق نقطۂ نظر کے فہم کے لحاظ سے واضح فرق ہوگا، جسے دور کرنے کی ضرورت ہوگی۔

4) حزب کے حلقہ اولیٰ یعنی قیادت کی فکر ایک پائیدار قاعدہ کی بنیاد پر ہوگی اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ فکر لازماً عمل سے متصل ہو، اسی طرح فکر اور عمل دونوں ایک متعین مقصد تک پہنچنے کے لئے ہوں۔ چنانچہ اس قیادت کے اندر آئیڈیالوجی کے مجسم ہونے کی وجہ سے اور اس قیادت کی فکر کے مذکورہ قاعدہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے ایک پائیدار ایمانی فضا (جو ایمانی) پیدا ہوگی، یہی فضا حالات کو مطیع کرنے اور بدلنے میں معاون ہوگی، کیونکہ یہ فکر رونما ہونے والے حالات کے مطابق اپنی صورت تبدیل نہیں کرتی بلکہ حالات کو اپنی فکر کے مطابق ڈھالتی ہے۔ اس کے برعکس معاشرہ اپنی فکر کے لئے کوئی بنیاد نہیں رکھتا اور نہ ہی اپنے اُس مقصد کو جانتا ہے جس کے لیے اُسے سوچنا اور عمل کرنا چاہیے بلکہ اس معاشرے کے افراد کا مقصد فقط وقتی اور خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں کوئی ایمانی فضاء نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو موجودہ حالات کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں حزب کا پہلا حلقہ سب سے پہلے وجود میں آتا ہے وہاں ابتداء میں اِس حلقہ اولیٰ اور اس معاشرے کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہوتا ہے۔

5) علاوہ ازیں حزب کی قیادت پر یہ لازم ہے کہ وہ ایمانی فضاء کو وجود میں لائے جس سے سوچنے کا ایک خاص طریقہ مقرر ہو جائے گا۔ چنانچہ اپنی جسامت کی صحیح اور انتہائی سرعت سے نشو و نما کے لیے اس قیادت کے لیے ایسے اعمال کرنا بھی ضروری ہیں جس سے وہ اپنی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد کے ماحول کو بھی صاف ستھرا کر دے۔ اسی طرح حزب کے اِس حلقہ اولیٰ کو اپنے آپ کو نہایت تیز رفتاری سے ایک حزبی گروہ میں اور پھر ایک مکمل حزب میں تبدیل کرنا ہوگا، جو معاشرے میں اپنے آپ کو یوں قائم کرے کہ وہ اس معاشرے پر اثر انداز ہو نہ کہ معاشرہ اس حزب پر اثر انداز ہو جائے۔

6) ان اعمال کا تقاضا ہے کہ معاشرے، اِس کے افراد اور حالات کا باریک بینی اور انتہائی بیداری سے مطالعہ کیا جائے اور اس بات سے انتہائی محتاط رہا جائے کہ حزب کے سٹرکچر میں کوئی فاسد عنصر سرایت نہ کر جائے، اور اسی طرح اس بات سے بھی احتیاط کی جائے کہ حزب کے ان ڈھانچوں میں سے کسی ڈھانچے کے بنانے میں، کہ جن پر حزب کی عمارت کھڑی ہے، کوئی ایسی غلطی نہ ہو جائے

جس سے حزب ایسی سمت کی طرف جھک جائے جو درست نہ ہو اور حزب دھڑے بندی کا شکار ہو جائے۔

7) یہ بات بہت ہی ضروری ہے کہ حزب کے اراکین کے مابین تعلق صرف راسخ و پائیدار عقیدہ اور حزب کی پختہ ثقافت ہو، اور حزب کو چلانے کا قانون کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا ہوا وہ انتظامی قانون نہیں بلکہ یہی عقیدہ وہ قانون ہو جس کے مطابق حزب کو چلنا چاہیے۔ اس عقیدے اور ثقافت کو مضبوط کرنے کا طریقہ تدریس اور سوچ بچار کرنا ہے، تاکہ ایک مخصوص ذہنیت کی نشوونما ہو سکے اور جذبات سے متصل فکر کو پیدا کیا جا سکے۔ یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ حزب پر ایمانی فضا غالب رہے تاکہ حزب کے دو عناصر یعنی دل و دماغ باہم مربوط ہوں۔ اس لئے آئیڈیالوجی پر ایمان لازمی ہے تاکہ حزب کے افراد کے قلب باہم جڑ جائیں۔ پھر دوسرے ربط یعنی عقل کو مربوط کیا جائے جو آئیڈیالوجی کا گہرائی سے مطالعہ کرنے، اس کو یاد کرنے، اس کو محفوظ کرنے اور اس کو سمجھنے سے ہوگا۔ یوں اِس کے نتیجے میں ایک حزب صحیح طریقے سے تیار ہوگی اور اس کا تعلق انتہائی مستحکم اور پائیدار ہوگا اور یہ اپنے رستے میں آنے والے ہر قسم کے طوفانوں کے سامنے ڈٹنے والی بنے گی۔

8) حزب کی قیادت (حزب کا پہلا حلقہ) ایک پہلو سے موٹر سے مشابہ ہے، جبکہ ایک اور پہلو سے وہ اس سے مختلف ہے۔ مشابہت کا پہلو یہ ہے کہ:

مثلاً پٹرول سے چلنے والے انجن کے اندر حرارتی طاقت ہے، جو کہ انجن کی حرکت کے دوران شعلہ اور پٹرول سے پیدا ہوتی ہے۔ اس حرارتی طاقت سے ہوا کا دباؤ پیدا ہوتا ہے۔ یہ دباؤ انجن میں موجود پسٹن کو دھکیلتا ہے، جس سے موٹری حرکت پیدا ہوتی ہے اور یہی حرکت دوسرے پرزوں کو بھی متحرک کرتی ہے اور اس سے وہ مشین چلتی ہے۔ اس لئے یہ شعلہ، پٹرول اور موٹری حرکت ہی اصل چیزیں ہیں کیونکہ انہی کی وجہ سے حرارتی طاقت کا دباؤ پیدا ہوتا ہے، اور یہی دباؤ دوسرے پرزوں کو حرکت میں لاتا ہے یوں موٹر چل پڑتی ہے۔ جب اس موٹر کی حرکت بند

ہو جائے گی تو دوسرے تمام پرزے بھی رک جائیں گے۔ اس لئے اس شعلے کا وجود، پٹرول اور موٹری حرکت کا وجود انتہائی ضروری ہے تا کہ موٹر گھومتی رہے اور پوری مشین چلتی رہے۔ حزب کی قیادت (حزب کا پہلا حلقہ) بھی اسی طرح ہے کیونکہ اس میں فکر (فکرۃ) گویا کہ شعلہ ہے اور قیادت میں موجود بیدار اشخاص کے احساسات پٹرول کی مانند ہیں اور وہ انسان جس کا احساس فکر سے متاثر ہوتا ہے تو وہ اس موٹری حرکت کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان کے اندر فکر اور احساس کا ملاپ ہوتا ہے تو حرارتی طاقت وجود میں آتی ہے اور پس یہ حرارتی طاقت قیادت کو متحرک کرتی ہے۔ قیادت کی یہ حرکت حزب کے تمام اجزا یعنی افراد، حلقات، مقامی کمیٹیوں وغیرہ پر لاگو (impose) ہوتی ہے اور وہ قیادت کی حرارت سے متاثر ہوتے ہیں اور سب ایک مشین کی طرح متحرک ہو جاتے ہیں۔ یوں حزب اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور پھلنا پھولنا شروع کر دیتی ہے۔

پس یہ ضروری ہے کہ حزب کی قیادت کی جانب سے حزب کے تمام اجزا تک حرارتی طاقت برابر پہنچتی رہے تا کہ حزب چلتی رہے، جیسا کہ مشین کے چلنے کے لئے موٹری حرکت ضروری ہوتی ہے۔ یہ وہ مشابہت ہے جو ایک موٹر اور حزب کی قیادت کے درمیان ہے۔ اس لئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ حزب کی قیادت اس پہلو کا لحاظ رکھے اور حزب کے باقی اجزا کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھے، تا کہ قیادت کی حرارت سب پر اثر انداز ہو۔ پس جب وہ کئی بار رابطہ قائم کرنے کے بعد یہ مشاہدہ کرے کہ باقی ممبران اور کمیٹیاں صرف اسی وقت متحرک ہوتی ہیں جب ان کو حرکت دی جائے تو اس بات سے قیادت کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسے سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک طبعی بات ہے، کیونکہ مشین صرف اس وقت چلتی ہے جب انجن چلے اور اس سے حرارت پیدا ہو۔

تاہم انجن جو مشین کے باقی حصوں پر اپنی حرکت کو لاگو (impose) کرتا ہے، کے برعکس حزب کی قیادت (حزب کا پہلا حلقہ) محض اپنی حرکت کو پوری حزب پر لاگو کرنے کے ذریعے حزب کے دیگر حصوں کو متحرک نہیں کرتی۔ بلکہ اپنی حرکت کو لاگو کرنے سے باقی اجزاء کو متحرک کرنے کا کام صرف ابتداء میں ہوتا ہے، چنانچہ جب حزب چل پڑتی ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا۔

چنانچہ اِس پہلو سے قیادت (حزب کا حلقہ اولیٰ) انجن سے مختلف ہے۔ انجن، مشین کو ہمیشہ حرکت میں رکھنے کے لیے لازمی ہے، جبکہ قیادت کوئی مصنوعی انجن نہیں بلکہ معاشرتی انجن ہے۔ حزب کے ممبران، اس کے حلقات اوراس کی مقامی کمیٹیاں انسانوں پر مشتمل ہوتے ہیں نہ کہ لوہے کے پرزوں پر۔ ان کے اندر زندگی ہے اور وہ قیادت کی حرارت سے متاثر ہوتے ہیں، یعنی اس آئیڈیالوجی کی حرارت سے متاثر ہوتے ہیں جو قیادت (حلقہ اولیٰ) کے اندر مجسم ہوچکی ہے۔ اس لئے وہ فکر (فکرۃ) کو سمجھنے اور حزبی قیادت کی حرارت سے منسلک ہونے کے بعد اس انجن کا جزو بن جاتے ہیں۔ تب حرارتی طاقت کی وجہ سے محض قیادت کی حرکت ہی طبعی طور پر پورے حزب میں حرکت پیدا کرتی ہے، کیونکہ حزب ایک معاشرتی انجن ہے اور تمام حزب میں ایک ہی فکر پائی جاتی ہے۔ اس لئے صرف قیادت ہی ایسی نہیں کہ اس میں انجن والی حرکت پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، بلکہ حزب کی نشوونما اور مکمل تشکیل سے پورے حزب کے اندر اس طرز کی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حزب اپنے چلنے کے لیے قیادت کی جانب سے حرکت دلانے یا حرارت پیدا کرنے کی محتاج نہیں رہتی، بلکہ حزب کے اراکین کے اندر اسلام کی آئیڈیالوجی گردش کرتی رہتی ہے جس کی وجہ سے اس کے اراکین، اس کے حلقات اور مقامی کمیٹیاں قیادت کی طرف سے حرکت دلائے بغیر خود بخود چلتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حزب کے ہر جزو کی حرارت اسی جزو سے ہی پیدا ہو رہی ہوتی ہے اور اس فکری کُل سے جو پورے حزب کے اندر گردش کر رہا ہے اور حزب کے اجزا کے ساتھ طبعی طور پر جڑا ہوا ہے۔

9) ایک آئیڈیالوجیکل حزب تین مراحل سے گزر کر معاشرے پر اپنی آئیڈیالوجی کو نافذ کرتی ہے:

پہلا مرحلہ: تدریس وتثقیف کا مرحلہ تا کہ ایک حزبی ثقافت تیار کی جائے۔

دوسرا مرحلہ: جس معاشرے میں وہ ہے اس معاشرے کے ساتھ تفاعل کا مرحلہ، تا کہ آئیڈیالوجی سے آگاہی کے نتیجے میں آئیڈیالوجی کو معاشرے میں ایک عرف عام کی حیثیت حاصل ہو جائے، پورا معاشرہ اسے اپنی آئیڈیالوجی سمجھے اور سب مِل کر اِس کی حفاظت کریں۔ اس

مرحلے میں امت اور اُن لوگوں کے مابین جدوجہد شروع ہوتی ہے جو اِس آئیڈیالوجی کے نفاذ کے رستے میں رکاوٹ بنتے ہیں، جیسے استعمار یا استعمار کے سامنے جھک جانے والا حکمران ٹولہ اور وہ لوگ جو اندھیرے میں رہنا پسند کرتے ہیں اور وہ جو بیرونی ثقافت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ جدوجہد امت کرے گی کیونکہ وہ اس آئیڈیالوجی کو اپنی آئیڈیالوجی سمجھے گی اور حزب کو اپنا قائد سمجھے گی۔

تیسرا مرحلہ: امت پر آئیڈیالوجی کے نفاذ کے لیے امت کے ذریعے مکمل طور پر اتھارٹی حاصل کرنے کا مرحلہ تاکہ آئیڈیالوجی کو امت پر نافذ کرنے کے لیے حکمرانی کو طریقے کے طور پر اختیار کیا جائے۔ اس مرحلہ سے حزب کارزارحیات میں عملی طور پر داخل ہوتی ہے۔ چنانچہ آئیڈیالوجی کی طرف دعوت ریاست اور حزب کے اصل کام کے طور پر باقی رہے گی کیونکہ آئیڈیالوجی ہی وہ پیغام ہے جس کی ریاست اور امت علمبردار ہونگی۔

10) پہلا مرحلہ حزب کے قیام کا (تاسیسی) مرحلہ ہوتا ہے، اس مرحلہ میں امت کے تمام افراد کو درست ثقافت سے بالکل خالی سمجھا جائے گا۔ چنانچہ حزب اُن افراد کی ثقافتی تربیت کرے گی جو حزب کے اندر شمولیت اختیار کرنا چاہیں گے، اور پورے معاشرے کو حزب کے سکول کی مانند تصور کیا جائے گا۔ حزب کی کوشش ہوگی کہ وہ کم سے کم وقت میں ایک ایسا گروہ تیار کر سکے جو معاشرے کے ساتھ تفاعل کرنے پر قادر ہو۔

ہاں یہ بات سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ یہ ثقافتی عمل تعلیمی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک تعلیمی ادارے کے عمل سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ چنانچہ یہ ثقافتی تربیت اِس سمجھ کے ساتھ آگے بڑھنی چاہیے کہ آئیڈیالوجی ہی اُستاد ہے، اور جو علم وثقافت حاصل کی جارہی ہے وہ صرف آئیڈیالوجی تک محدود رہے، اس طرح یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ثقافت زندگی کے میدان میں عملی طور پر داخل ہونے اور عملی طور پر اپنانے کے لئے حاصل کی جارہی ہے۔

مزید برآں حزب کی ثقافت کو علمی ثقافت بننے سے بچانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے

کہ یہ ثقافت بذاتِ خود عملی ہو اور اِسے اِس لیے حاصل کیا جارہا ہے کہ اِس پر عمل کیا جائے گا اور اراکین کے اذہان اور ثقافت کے علمی پہلو کے درمیان ایک آڑ ہمیشہ برقرار رہنی چاہیے، تاکہ حزبی ثقافت درسگاہ کی علمی ثقافت نہ بن کر رہ جائے۔

11) حزب وہ جماعت ہے جو ایک ایسی فکر اور طریقہ (یعنی ایک آئیڈیالوجی) کی بنیاد پر قائم ہے، جس پر حزب کے اراکین ایمان رکھتے ہیں۔ یہ جماعت معاشرے کے افکار اور اُس کے احساسات کی نگرانی کرتی ہے تاکہ معاشرے کو افکار اور احساسات کے لحاظ سے بلند کیا جائے۔ حزب امت کا وہ سکول ہے جو امت کی ثقافتی تربیت کرتا ہے اور اسے عالمی سطح پر کردار ادا کرنے کی طرف دھکیلتا ہے۔ چنانچہ حزب ہی وہ حقیقی سکول ہے جو یہ کام سرانجام دے سکتی ہے جبکہ تعلیمی اداروں کے ذریعے یہ ممکن نہیں، چاہے اِن تعلیمی اداروں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور وہ کتنے ہی ہمہ گیر کیوں نہ ہوں۔

تاہم حزب اور ایک سکول کے درمیان بہت فرق ہے جسے سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ فرق متعدد پہلوؤں سے واضح ہے:

(i) ایک تعلیمی ادارہ خواہ اس کا پروگرام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو وہ امت کی نشاۃِ ثانیہ کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ بلکہ نشاۃِ ثانیہ صرف اُس وقت ممکن ہے جب ایک حزب معاشرے میں قائم ہو، جو معاشرے کے لیے ایک سکول کا کام کرے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سکول طبعی طور پر ایک مخصوص نظام کے ماتحت ہوتا ہے۔ چاہے یہ سکول مروجہ رسوم ورواج سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو اس کا ایک خاص ڈھنگ ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص شکل اور اوصاف ہوتے ہیں۔ چنانچہ طبعی طور پر اس کے اندر بدلتے حالات وواقعات کا جواب دینے کے لیے اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی قدرت نہیں ہوتی، بلکہ اگر وہ اس کا ارادہ بھی کرے تو اس کے لئے ایک پیچیدہ عمل اور کچھ خاص وقت کی ضرورت ہوتی ہے تب جا کر وہ مطلوبہ کیفیت کو پیدا کر پاتا ہے۔ مزید برآں سکول کا سیٹ اَپ ایک غیر لچکدار بنیاد پر استوار ہوتا ہے جو ایسی تبدیلی میں رکاوٹ ہے۔

(ii) جبکہ ایک حزب اگر ایک صحیح پروگرام پر قائم ہوتو اس کے اندر یہ صفات نمایاں ہوں گی:

1: زندگی، یعنی اس کی نشو ونما ہو۔

2: ترقی، یعنی وہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف منتقل ہو۔

3: حرکت، یعنی وہ اِس قابل ہو کہ وہ معاشرے کے ہر طبقہ میں داخل ہو سکے اور ملک کے کسی بھی حصے کی طرف منتقل ہو سکے۔

4: احساس، یعنی معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کو محسوس کرے اور اس پر اثر انداز ہو۔

جبکہ حزب کا سیٹ اَپ زندگی اور جذبات کو مخصوص تشکیل دینے کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔ پس حزب میں ایک مسلسل پراگریس ہوتی ہے اور اس کے اندر مستقل طور پر تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے اور وہ کسی لگے بندھے انداز سے آگے نہیں بڑھتی، کیونکہ اس کو تو زندگی اور اس کے مظاہر کے ساتھ چلنا ہوتا ہے۔ اور حزب زندگی کو اپنے ایمانی ماحول کے ذریعے شکل دیتی ہے اور موجودہ حالات کو بدل کر انہیں اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق بناتی ہے۔

(iii) تعلیمی ادارے اِس لیے قائم کئے جاتے ہیں کہ وہ ایک فرد کی تربیت، تعلیم اور تہذیب اُس کے ایک متعین فرد ہونے کی حیثیت سے کریں۔ اگرچہ تعلیمی ادارہ بھی اپنی ذات کے اعتبار سے ایک چھوٹی سی جماعت ہوتا ہے مگر تعلیمی پہلو کے لحاظ سے اُس کی توجہ انفرادی نوعیت کی ہی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اُس کے نتائج بھی انفرادی ہونگے نہ کہ اجتماعی۔ مثال کے طور ایک ایسا شہر جس کے باشندوں کی تعداد دس ہزار ہے اور اس شہر میں اتنے تعلیمی ادارے موجود ہیں جو ایک ہزار طلباء کو تعلیم دے سکیں تب بھی یہ تعلیمی ادارے اُس شہر میں اجتماعی نشاۃِ ثانیہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ہونگے۔

(iv) تعلیمی اداروں کے برعکس ایک حزب اِس لئے قائم کی جاتی ہے کہ وہ ایک معاشرے میں

موجود افراد سے قطع نظر، اس کے ایک معاشرہ ہونے کے اعتبار سے اجتماعی تربیت اور تثقیف کرے۔ حزب کبھی بھی افرد کی طرف ان کے خاص افراد ہونے کی حیثیت سے نہیں دیکھتی، بلکہ انہیں اس نظر سے دیکھتی ہے کہ وہ اِس معاشرے کا حصہ ہیں۔ چنانچہ حزب اِن کی ایسی اجتماعی تربیت کرتی ہے کہ ان کی اصلاح معاشرے کے حصے کے طور پر ہو نہ کہ فرد کے طور پر۔ یہی وجہ ہے کہ حزب کے اثرات اجتماعی ہوتے ہیں انفرادی نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی علاقے کے باشندوں کی تعداد دس لاکھ ہے اور وہاں حزب کے اراکین کی تعداد ایک سو ہے تو حزب اپنے ان سو افراد کے ذریعے وہاں وہ نشاۃِ ثانیہ پیدا کرسکتی ہے جس کے پیدا کرنے سے ایک تعلیمی ادارہ عاجز ہے خواہ وہ اس کے لیے کتنی بھی جدوجہد کرے اور کتنا ہی وقت گزارے اور وہاں سے کتنے ہی طلبا فارغ التحصیل ہو رہے ہوں۔

(v) تعلیمی ادارے اِس لئے قائم کئے جاتے ہیں کہ وہ ایسا فرد تیار کریں جو اُس معاشرے پر اثر انداز ہو جس معاشرے میں وہ فرد زندگی گزارتا ہے، حالانکہ وہ فرد اس معاشرے پر صرف جزوی طور پر اثر انداز ہوگا کیونکہ معاشرے کے اجتماعی جذبات کے مقابلے میں ایک فرد کی حیثیت سے اِس کے اپنے جذبات انتہائی کمزور اور معاشرے کے جذبات پر اثر انداز ہونے اور معاشرے کے افکار کو بیدار کرنے کے حوالے سے انتہائی ناکافی ہوتے ہیں۔

(vi) جبکہ تعلیمی ادارے کے برعکس حزب اِس لئے قائم کی جاتی ہے کہ وہ معاشرے کو تیار کرے تاکہ وہ فرد پر اثر انداز ہو۔ صرف معاشرہ ہی کُلی طور پر اثر پیدا کرسکتا ہے کیونکہ اِس کے جذبات مضبوط ہوتے ہیں اور وہ اِس قابل ہوتے ہیں کہ فکر کو بیدار کرسکیں۔ اور اس لیے بھی کہ اِس کا ایک فرد پر مضبوط اثر ہوتا ہے اور وہ اُن میں قلیل ترین محنت اور مدت میں نشاۃِ ثانیہ پیدا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ جذبات ہی ہیں جو افکار کو بیدار کرتے ہیں اور جذبات اور افکار کے درمیان تفاعل ہی وہ پہلا قدم ہے جو نشاۃِ ثانیہ کی طرف جائے گا۔

چنانچہ حزب اور تعلیمی ادارے میں جو فرق ہے اُس کا خلاصہ اِن نکات میں بیان کیا

جا سکتا ہے:

(ا) تعلیمی ادارہ ایک روٹین کا پابند اور نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے پر قادر نہیں ہوتا۔ جب کہ حزب مسلسل آگے بڑھنے والی، متحرک اور زندگی میں ابھرنے والے نئے حالات و واقعات کا جواب دینے والی ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنی ایمانی فضا سے زندگی کو مطلوبہ شکل دیتی ہے۔

(ب) تعلیمی ادارہ فرد کی ثقافتی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ معاشرے پر اثر انداز ہو اور اِس کے نتائج بھی انفرادی ہوتے ہیں جبکہ حزب معاشرے کی ثقافتی تربیت کرتی ہے اور اِس کے نتائج بھی اجتماعی ہوتے ہیں۔

(ج) تعلیمی ادارہ ایک فرد کے جذبات کو تیار کرتا ہے تاکہ وہ معاشرے کے جذبات پر اثر انداز ہو سکے۔ تاہم فرد اِس قابل نہیں ہوتا کہ وہ معاشرے کے جذبات پر اثر انداز ہو سکے یا پھر اس کے افکار کو بیدار کر سکے۔ جبکہ حزب معاشرے کے جذبات کو مجموعی طور پر تیار کرتی ہے تاکہ وہ فرد کے جذبات پر اثر انداز ہو سکے۔ پس معاشرہ افراد پر اثر انداز ہونے کے قابل ہوتا ہے اور ان کے افکار کو مستقل طور پر بیدار کرتا ہے۔

12) اس مرحلے میں ہمیشہ اس بات کا ذہن نشین ہونا ضروری ہے کہ معاشرہ پورے کا پورا حزب کا ایک وسیع و عریض سکول ہے۔ تاہم اِس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے ذہن میں اِس گہرے فرق کو بھی رکھنا ضروری ہے جو حزب کے ثقافتی حلقات کے لحاظ سے ایک تعلیمی ادارے اور حزب کے مابین ہے۔

جہاں تک اس بات کے فہم کا تعلق ہے کہ پورا معاشرہ حزب کا ایک بڑا اسکول ہے تو یہ اس لیے کہ اس وقت حزب کا کام معاشرے میں سچے عقائد اور صحیح تصورات کو پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ یہ مقصد ایک ایسے تدریسی عمل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا جہاں حزب کی آئیڈیالوجی ہی استاد

ہواور حزب کی ثقافت ہی وہ مضمون ہو جو پڑھایا جائے۔ یہ آئیڈیالوجی اور یہ ثقافت ان لوگوں سے جھلکے گی جن میں یہ آئیڈیالوجی مجسم ہو جائے گی۔ یہی لوگ براہِ راست معاشرے میں استاد ہوں گے۔ علاقائی کمیٹیاں اپنے حلقات کے ساتھ معاشرے کے کلاس رومز کے طور پر ہونگے جبکہ پورے کا پورا معاشرہ حزب کا سکول ہوگا۔ تدریسی عمل کا یہ مرحلہ اِس بات کو ضروری قرار دیتا ہے کہ حزب کے اراکین اور وہ لوگ جو حزب کے تصورات کو تبنی کرتے ہیں، وہ تدریس باریک بینی سے کریں تاکہ اُن کے اندر صحیح فہم پیدا ہو اور ہر وقت حزب کی ثقافت کو سیکھنے کا عمل جاری رکھنا ضروری ہے۔ مزید برآں اُن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حزب کے تبنی شدہ دستور، اہم قوانین اور عام قواعد کو بھی ذہن نشین کریں۔ اس لئے سکول کے طرز کی تدریس بہت ضروری ہے۔ اس وجہ سے ہر اس شخص کو، جو حزب میں داخل ہوتا ہے، اِن مراحل سے گزارا جائے، قطع نظر اس کے کہ وہ شخص کسی یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے یا اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے یا وہ اَن پڑھ ہے، پس اگر اُس میں یہ صلاحیت موجود ہے تو اس کی تثقیف کی جائے۔ کسی بھی فرد کے ساتھ اِس ثقافت کے بارے میں سستی برتنے سے وہ فرد حزب کے دائرے سے باہر ہی رہے گا اگرچہ اسے حزب میں شمار کیا جاتا ہو، نیز اس کے نتیجے میں حزب کے عمومی ڈھانچے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اس طرح اس مرحلے میں یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ حزب اُس وقت تک عملی جدوجہد کا آغاز نہیں کرے گی جب تک حزب کے پاس اس ثقافت سے مزین افراد نہ ہوں، کیونکہ یہ مرحلہ صرف ثقافت کا مرحلہ ہے۔

اس بات کا ادراک بھی ضروری ہے کہ ثقافت کے لحاظ سے سکول اور حزب میں بڑا فرق ہے تاکہ کہیں حزب کی ثقافت سکول کی ثقافت کی طرح ہو کر نہ رہ جائے اور حزب اپنی فعالیت کھو نہ بیٹھے۔ اس لئے حزب کے شباب کو حزبی ثقافت کے علمی پہلو سے بہت دور رکھا جائے اور اس بات کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ حزبی ثقافت کا مقصد تصورات کو تبدیل کرنا، زندگی کے میدان میں اس پر عمل کرنا اور امت کو فکری قیادت کا علمبردار بنانا ہے۔ چنانچہ اِس دعوت کے علمبرداروں کے لیے

اس ثقافت کے علمی پہلو کی طرف لپکنا جائز نہیں۔ اگر کسی کو علمیت ہی کی ضرورت ہے تو اس کی جگہ تعلیمی ادارہ ہے نہ کہ حزب۔ اس ثقافت کے علمی پہلو کی طرف مائل ہونا خطرناک ہے کیونکہ اس سے دعوت کے کام کی نوعیت متاثر ہوتی ہے اور حزب کے دوسرے مرحلے کی طرف منتقل ہونے میں تاخیر کا سبب بنتی ہے۔

13) حزب کا دوسرا مرحلہ امت کے ساتھ تفاعل کا مرحلہ ہے، یہی جدوجہد کا مرحلہ ہے۔ یہ مرحلہ انتہائی دقتِ نظر کا محتاج ہے۔ اس مرحلے میں کامیابی حزب کی کامیاب بناوٹ کی دلیل ہے۔ اس مرحلے میں ناکامی کا مطلب یہ ہے کہ حزب میں کوئی خلل ہے جس کی اصلاح انتہائی ضروری ہے۔ چونکہ یہ مرحلہ پہلے مرحلے پر استوار ہوتا ہے لہٰذا پہلے مرحلے میں کامیابی دوسرے مرحلے کی کامیابی کے لئے بنیادی شرط ہے۔ تاہم! پہلے مرحلے میں صرف ثقافتی لحاظ سے کامیابی اس مرحلے میں کامیابی کے لئے کافی نہیں، بلکہ یہ ثقافتی کامیابی لوگوں میں معروف ہو یعنی لوگوں کو معلوم ہو کہ یہاں دعوت ہو رہی ہے اور فلاں رکن اس دعوت کا علمبردار ہے۔ اس طرح حلقات میں ثقافتی بناؤ کے دوران اجتماعی روح کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ اراکین کو اس معاشرے میں گھل مل کر رہنا چاہیے جس میں وہ زندگی گزارتے ہیں اور ان کو اس معاشرے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ جب وہ دوسرے مرحلے میں داخل ہوں تو اجتماعی رجحان موجود ہو۔ اس سے ان کے لیے امت کے ساتھ تفاعل آسان ہوگا۔

14) حزب کا رکن ثقافتی دور سے تفاعلی دور کی طرف اس وقت تک منتقل نہیں ہوسکتا ہے جب تک وہ ثقافت میں خوب پختہ نہ ہو جائے اور ثقافت کے اندر اُس کی پختگی اُس کی نفسیہ کو اُس کی عقلیہ سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اُسے ایک اسلامی شخصیت بناتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لاَ یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّیٰ یَکُوْ نَ ھَوَاہُ تَبْعاً لِمَ جِئْتُ بِہِ))

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات اس (شریعت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں“ (بیھقی)

مزید برآں اُس کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ اسلامی دعوت کا علمبردار ہے۔ حلقات میں

ہونے اور معاشرے کے ساتھ رہنے اور حلقات میں موجود ہونے کی وجہ سے اس کے اندر اجتماعی میلانات اس قدر مضبوط اور واضح ہوں کہ گوشہ نشینی کا تصور اس کے اندر سے بالکل ختم ہو جائے۔ کیونکہ گوشہ نشینی بزدلی اور نا امیدی کا مجموعہ ہے، اس لئے افراد اور معاشرے سے اس تصور کو ختم کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔

15) یقیناً حزب ثقافتی دور سے تفاعلی دور کی طرف اس طرح طبعی طور پر منتقل ہوتی ہے کہ اگر وہ مناسب وقت سے پہلے ہی منتقل ہونے کا ارادہ کرے تو منتقل نہیں ہوسکتی۔ حزب ثقافتی دور میں نقطۂ ابتدا کو عبور کرتی ہے کیونکہ ثقافت کے ذریعے آئیڈیالوجی افراد میں مجسم ہو جاتی ہے اور معاشرہ دعوت اور آئیڈیالوجی کو واضح طور پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ پس جب آئیڈیالوجی افراد میں مجسم ہو جاتی ہے یعنی وہ ان کے نفوس میں مضبوطی سے قائم ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی معاشرے میں آئیڈیالوجی کا مکمل احساس ہوتا ہے تو دعوت طبعی طور پر نقطۂ ابتدا عبور کر چکی ہوتی ہے، اب اس کا نقطۂ انطلاق کی طرف بڑھنا ضروری ہے۔ چنانچہ جب حزب نقطۂ انطلاق کی طرف بڑھنا چاہے تو اُس کا امت کو مخاطب کرنا ضروری ہے۔ امت کو مخاطب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امت کو اپنا مخاطب بنانے کی کوشش (attempt to address) کا آغاز کیا جائے یہاں تک کہ اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو جائے، پھر وہ معاشرے کو براہِ راست مخاطب کرنا شروع کر دے گی۔ مخاطب بنانے کی کوشش کے سلسلے میں حزب حلقات میں مرتکز ثقافتی تربیت اور جہاں ممکن ہو لوگوں کی اجتماعی ثقافتی تربیت کرے گی، اور وہ استعمار کے منصوبوں کو بے نقاب کرے گی اور امت کے مفادات کی تبنی کرے گی۔ حزب جب اس قابل ہو جائے کہ وہ ان چار چیزوں میں کامیابی حاصل کرے تب وہ امت کو براہِ راست مخاطب کرے گی۔ یوں حزب نقطۂ انطلاق کی طرف طبعی طور پر منتقل ہوتی ہے۔ حزب کا نقطۂ انطلاق کی طرف یہ انتقال ہی اس کو طبعی طور پر پہلے مرحلے یعنی ثقافتی مرحلے سے دوسرے مرحلے یعنی تفاعلی مرحلے کی طرف منتقل کرتا ہے اور یوں طبعی طور پر امت کے ساتھ تفاعل درست وقت پر شروع ہو جاتا ہے۔

16) اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے امت کے ساتھ یہ تفاعل حزب کے لئے انتہائی ضروری

ہے، کیونکہ اگر امت ان کے ساتھ نہ ہوتو خواہ امت کے اندر حزب کے اراکین کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو یا پھر وہ کتنے ہی مضبوط ہوں وہ اکیلے کچھ نہیں کر سکتے۔ امت کے ساتھ تفاعل کے بغیر اور اس تفاعل میں کامیابی کے بغیر وہ امت کو اپنے ساتھ کام کے لئے آگے بڑھا سکتے ہیں نہ ہی امت ان کے ساتھ چلے گی۔ امت کے ساتھ تفاعل کا مطلب یہ نہیں کہ حزب کے اراکین لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے گرد جمع کر لیں بلکہ تفاعل کا مطلب یہ ہے کہ امت حزب کی آئیڈیالوجی کو، جو کہ اسلام ہے، اپنی آئیڈیالوجی کے طور پر اپنا لے۔ یہ آئیڈیالوجی امت میں پہلے سے ہی ثقافتی و تاریخی میراث کے طور پر اور اس کے جذبات میں موجود ہے۔ اور یہ امت کا احساس ہی ہے جو ایک فکر کی طرف منتقل ہوا، جو ایک ممتاز گروہ کے اندر صاف شفاف ہو گئی، اور اس میں سے حزب نے جنم لیا۔ اور ان احساسات کو یہ بنیاد مل گئی کہ فکر اور عمل ایک متعین مقصد کے حصول کے لیے ہوں اور یہ آئیڈیالوجی کی حقیقی تعبیر ہے۔ چنانچہ آئیڈیالوجی یعنی اسلام امت کا اندرونی احساس ہے اور حزب اِس احساس کا اظہار ہے۔ پس اگر حزب اپنے خطاب میں صاف وشفاف، زبان میں واضح اور اظہار میں سچی ہو گی تو امت جلد ہی اس آئیڈیالوجی کو سمجھ لے گی اور حزب کے ساتھ تفاعل کرے گی۔ یوں نتیجتاً پوری امت کو حزب سمجھا جائے گا اور ایک منتخب گروہ حزبی تکتل کے ذریعے اس تحریک کی قیادت کرے گا۔ اس تحریک کے ذریعے امت حزب کی قیادت میں تیسرے مرحلے کی طرف بڑھے گی۔ یہ مرحلہ اتھارٹی حاصل کر کے حزب کے ذریعے آئیڈیالوجی کو انقلابی انداز میں نافذ کرنے کا مرحلہ ہے۔ حکومت کے ذریعے آئیڈیالوجی کو نافذ کرنا ہی فکرۃ کو نافذ کرنے کا واحد طریقہ ہے اور یہ آئیڈیالوجی کا ہی حصہ ہے۔

ہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس تفاعل کے دوران متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے انکی نوعیت کو سمجھنا لازمی ہے۔ اگرچہ یہ مشکلات بہت ساری ہیں تاہم ان میں سے اہم ترین یہ ہیں:

(ا) معاشرے میں نافذ موجودہ نظام اور آئیڈیالوجی کے درمیان تضاد:

یقیناً حزب کی آئیڈیالوجی موجودہ معاشرے کی نسبت سے زندگی کے لیے ایک نیا نظام ہے۔ اور یہ اس نظام سے متضاد ہے کہ جسے حکمران ٹولہ معاشرے پر نافذ کررہا ہے اور جس کے ذریعے لوگوں پر حکمرانی کررہا ہے۔ پس یہ حکمران طبقہ اِس آئیڈیالوجی کو اپنے لیے اور اپنے وجود کے لیے ایک خطرے کے طور پر محسوس کرے گا، اس لیے وہ اِس کے مدمقابل کھڑا ہوگا اور مختلف وسائل سے اس کے رستے میں رکاوٹیں ڈالے گا، جیسے حاملینِ دعوت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا، اُن کو ہراساں کرنا اور انہیں جسمانی اذیتیں دینا۔ چنانچہ آئیڈیالوجی کی دعوت کے ذریعے امت کے ساتھ تفاعل کرنے والے آئیڈیالوجی کے حاملین کے لیے ضروری ہے کہ جس حد تک ہوسکے وہ ان مصائب سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں اور اپنی دعوت کی تشریح کے ذریعے گمراہ کن پروپیگنڈے کا جواب دیں اور اپنی منزل کے حصول کے راستے میں ہر مشقت کو برداشت کریں۔

(ب) ان مشکلات میں سے ایک ثقافت کا اختلاف ہے:

امت میں جدا جدا افکار کی موجودگی کے ساتھ ساتھ معاشرے میں مختلف قسم کی ثقافتیں بھی موجود ہیں۔ تاہم امت کا احساس ایک ہی ہے۔ یہ تمام ثقافتیں بالخصوص استعماری ثقافتیں ان احساسات کے برعکس ہیں جبکہ آئیڈیالوجی کی ثقافت یعنی اسلامی ثقافت امت کے احساسات کی سچی تعبیر ہے۔ اگرچہ ثقافت سے متعلق معاشرے کی رائے عامہ، سکولوں، اداروں اور کلچرل سنٹرز میں رائج نصاب بیرونی ثقافت پر مبنی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور ثقافتی تحریکیں بھی اسی بیرونی ثقافت کے مطابق چل رہی ہیں۔ اس لیے حزب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ثقافت کے ذریعے دوسری ثقافتوں اور افکار کے خلاف جدوجہد کرے، یہاں تک کہ امت کے سامنے احساسات اور جذبات کی صحیح تعبیر واضح ہوجائے، اور امت اس کے ساتھ چل پڑے۔ اس لئے اس مرحلے میں حزب کی ثقافت اور اس کے افکار کا امت کی طرف اپنائی دوسری ثقافتوں اور افکار کے ساتھ ٹکراؤ لازمی ہے۔ یہ امت کے بیٹوں کے درمیان ٹکراؤ ہے پس یہ بیکار مناظروں کی مانند نہیں ہونا چاہیے بلکہ حزب ٹیڑھی لکیر کے ساتھ سیدھی لکیر کھینچنے کا طریقہ اختیار کرے گی اور ان بیکار مناظروں سے الگ رہے گی کہ جن کے نتیجے میں مخالف کا انانیت پر اتر آنے اور حقیقت سے اندھا

ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ بلکہ حزب کے اراکین کی طرف سے حزب کے افکار کی تشریح کی جائے، دوسرے افکار کی کجی اور دوسری ثقافتوں کے باطل ہونے اوران کے خطرناک نتائج کو بے نقاب کیا جائے۔ نتیجتاً امت ان باطل افکار سے منہ موڑ کر حزب کی ثقافت اوراس کے افکار کی طرف متوجہ ہوگی، بلکہ جب دیگر ثقافتوں اورافکار کی کجی ظاہر ہوجائے گی تو انہیں اختیار کرنے والے افراد بھی، اگر وہ مخلص، بیدار اور باکردار ہوں، ان سے منہ موڑ لیں گے۔ البتہ یہ حزب کے لیے مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ چنانچہ جہاں بیرونی ثقافت کم ہے وہاں امت کے ساتھ تفاعل وہاں کی نسبت زیادہ آسان ہے جہاں بیرونی ثقافت زیادہ ہے۔ اس طرح جہاں بیرونی ثقافت میں رنگے ہوئے افراد کی تعداد کم ہو وہاں اس جگہ کے مقابلے میں جہاں بیرونی ثقافت کے علمبرداروں کی تعداد زیادہ ہو، نشاۃِ ثانیہ آسان ہے۔ اس لیے حزب کو اس معاشرے کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ ہونا ہوگا جس کے ساتھ اُسے تفاعل کرنا ہے تا کہ ایسے طریقے سے آگے بڑھا جائے جو اِس معاشرے کے لحاظ سے مناسب ہو۔

(ج) ایک اور بڑی مشکل امت میں پائے جانے والے وہ حقیقت پرست (pragmatist) ہیں یعنی وہ افراد جو موجودہ حالات (status quo) سے چمٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

بیرونی ثقافت کی زہر آلودگی اور جہالت کی وجہ سے امت کے اندر اِن حقیقت پرستوں کے دو گروہ پائے جاتے ہیں۔

جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے تو یہ حقیقت پرستی کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور یہ حقیقت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں اوراس پر مطمئن ہوتے ہیں کہ گویا وہ حقیقت ایک حتمی امر ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت کو **مصدر تفکیر** بناتے ہیں اور حقیقت سے ہی اپنے مسائل کا حل اخذ کرتے ہیں۔ اِس مصیبت پر غالب آنے کا طریقہ یہ ہے کہ اِن سے گہری بحث کی جائے یہاں تک کہ انہیں معلوم ہوجائے کہ موجودہ حالات کو **موضوع تفکیر** بنانا چاہیے تا کہ اِس کو تبدیل کیا جاسکے۔ نتیجتاً یہ ممکن ہے کہ ایسے لوگ اپنی موجودہ فکر سے دست بردار ہوجائیں۔

حقیقت پرستوں کا دوسرا گروہ ان ظلمت پرستوں کا ہے جو نور میں زندگی گزارنے سے بالکل انکار کرتے ہیں کیونکہ یہ ظلمتوں میں زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں اور یہ پستی اور سطحیت کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ مزید برآں یہ جسمانی اور عقلی سستی کا شکار ہوتے ہیں، یہ اپنے آباؤاجداد کے قدیم افکار و تصورات کے ساتھ صرف ان کے قدیم ہونے کی وجہ سے چمٹے ہوئے ہوتے ہیں، اس وجہ سے یہی لوگ حقیقی حقیقت پرست ہیں کیونکہ ایسے لوگ اور حقیقت ایک ہی جنس کے ہیں، جو کہ فکری جمود ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ سخت محنت اور ثابت قدم رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مصیبت پر قابو پانے کا طریقہ ان کی تربیت اور ان کے تصورات کو صحیح کرنے کے لیے زبردست کوشش کرنا ہے۔

(د) دعوت کے راستے میں حائل ہونے والی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ لوگوں کا اپنے مفاد سے لگاؤ ہے۔ یہ اس طرح کہ انسان فطری طور پر اپنے ذاتی مفادات اور روزمرہ کے کاموں سے منسلک ہے اور عین اسی وقت میں وہ آئیڈیالوجی سے بھی وابستہ ہے۔ چنانچہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص کے مفادات آئیڈیالوجی کی طرف دعوت سے متصادم ہوں اور وہ اِن دونوں کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس مشکل پر قابو پانا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ایک شخص جو آئیڈیالوجی کا حامل ہے وہ دعوت اور حزب کو لازمی طور پر اس دائرے کا مرکز بنائے کہ جس کے گرد اس کے تمام ذاتی مفادات گردش کریں۔ پس اس شخص کے لیے کسی ایسے کام میں مشغول ہونا جائز نہیں جو دعوت سے متناقض ہو یا پھر دعوت کو بھول جانے یا دعوت میں رکاوٹ کا سبب بنے۔ یوں دعوت کے اس کے مفادات کے گرد گردش کرنے کی بجائے اس کے مفادات دعوت کے گرد گھومیں گے۔

(ھ) دعوت کے راستے کی رکاوٹوں میں سے ایک اسلام اور اس کی دعوت کے لئے مال و تجارت جیسے دنیاوی امور کی قربانی دینے کا مشکل ہونا ہے۔ اس مشکل پر اس طرح قابو پایا جا سکتا ہے کہ مومن کو اس بات کی یاددہانی کرائی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے مومنون سے ان کی جان اور مال خرید لیا ہے۔ یہ یاددہانی کرانا کافی ہے پھر اس راستے میں قربانی دینے یا نہ دینے کا

اختیار اس پر چھوڑ دیا جائے اور اسے مجبور نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب عبداللہ بن جحش کو مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے علاقے میں، قریش کی گھات لگانے کے لیے، ایک سریہ کا امیر بنا کر بھیجا تو آپ ؐ کو خط میں یہ لکھا:

((وَلا تُكْرِهَنَّ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِكَ عَلَى الْمسِيْرِ مَعَكَ وَامْضِ لِاَمْرِىْ فِيْمَنْ تَبِعَكَ))

''تم اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرنا اور میرے حکم کی تعمیل صرف ان لوگوں سے کرانا جو تمہاری اتباع کریں''

(و) بعض دفعہ معاشرے میں پایا جانے والا سکونت کا اختلاف مشکل بن جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ شہروں کا ماحول دیہاتوں کے ماحول سے مختلف ہوتا ہے اور اسی طرح خانہ بدوشوں اور خیمہ نشینوں کا ماحول ان دونوں سے مختلف ہوتا ہے۔ تمدنی اشکال کا یہ اختلاف حزب کو اس بات کی طرف اشارہ دے سکتا ہے کہ وہ تثقیف کے لیے یا آئیڈیالوجی کی طرف راہنمائی کے لیے مختلف طریقہ اختیار کرے۔ یہ انتہائی خطرناک امر ہے، کیونکہ امت کے اندر تمدنی اشکال خواہ کتنے ہی مختلف ہوں پھر بھی وہ ایک ہی امت ہے، اس کا احساس بھی ایک ہے اور اس کی آئیڈیالوجی بھی ایک ہے۔ اس وجہ سے امت کے اندر دعوت بھی ایک ہی قسم کی ہوگی، اس میں شہر یا دیہات یا پھر خانہ بدوش علاقے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوگا اور امت کے ساتھ تفاعل کا کام بھی ایک ہی ہوگا۔

17) تفاعل کے مرحلے میں حزب کو بذاتِ خود دو خطرات کا سامنا ہوسکتا ہے: ایک آئیڈیالوجیکل خطرہ اور دوسرا طبقاتی خطرہ۔

جہاں تک آئیڈیالوجیکل خطرے کا تعلق ہے تو یہ معاشرے کے رجحان اور اس کی طرف سے عارضی مگر زوردار مطالبات کی وجہ سے ہوسکتا ہے، اسی طرح یہ معاشرے کے ایک حصے کے پسماندہ خیالات کا حزب کے افکار پر غلبہ حاصل ہونے کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے۔ ان خطرات کی وجہ یہ ہے کہ جب حزب معاشرے کے میدانِ کارزار میں کودتی ہے تو امت کے ساتھ

تفاعل اور امت کی قیادت لینے کے لیے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ تعلقات قائم کرتی ہے۔ اِس وقت حزب اپنی آئیڈیالوجی سے مسلح ہوگی جبکہ اس کے مقابلے میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے اندر رجعت پسندانہ قدیم افکار، گزشتہ نسلوں کی موروثی چیزیں، خطرناک بیرونی افکار اور کافر استعمار کی تقلید جیسی متناقض باتیں جمع ہونگی۔ پس جب حزب لوگوں کے ساتھ تفاعل شروع کرے گی تو وہ لوگوں تک حزب کے آراء اور افکار پہنچانے کے ساتھ ساتھ اُن کے تصورات (مفاہیم) کو درست کرنے، اُن کے اندر اسلامی عقیدے کو جگانے اور اُن کے اندر خالص ماحول اور درست عرفِ عام پیدا کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرے گی اور وہ یہ کام حزبی مفاہیم کے ذریعے کرے گی۔ اس کے لیے دعوت اور نشر و اشاعت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ امت آئیڈیالوجی کی بنیاد پر حزب کے گرد ایسے جمع ہو جائے کہ امت کا آئیڈیالوجی پر ایمان مضبوط ہو جائے، حزب کے مفاہیم پر امت کا اعتماد بڑھے، حزب کے احترام اور اُس کی قدر میں اضافہ ہو اور امت حزب کی قیادت میں چلنے پر تیار ہو جائے۔ اِس موقع پر حزب کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ ایسے اراکین کی کثیر تعداد پیدا کرے جن پر امت کا اعتماد ہو تاکہ امت کی مکمل باگ ڈور اُن کے ہاتھمیں ہو، جیسا کہ فوج میں ایک جنرل کی حیثیت ہوتی ہے۔ اگر حزب تفاعل کے اِس حصے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ آئیڈیالوجی کی طے کردہ حدود کے اندر اور خطِ مستقیم سے ہٹے بغیر اپنے طے کردہ مقصد کے حصول کے لیے امت کی قیادت کرے گی۔

تاہم اگر حزب امت کے ساتھ تفاعل کو پورا کیے بغیر اور امت میں **الوعی العام** پیدا کئے بغیر اس کی قیادت کرنے کی کوشش کرے گی تو اس صورت میں حزب کی امت پر یہ قیادت آئیڈیالوجی کی بنیاد پر نہ ہوگی۔ بلکہ یہ قیادت اس بنیاد پر ہوگی کہ امت کے اذہان میں کیا چل رہا ہے اور یہ امت کے جذبات بھڑکانے اور ایسی تصویر کشی کرنے کی بنیاد پر ہوگی کہ امت کی آرزوئیں اب قریب الحصول ہیں۔

تاہم اس صورت میں لوگوں کے اندر سے پہلے والے جذبات جیسے وطنیت، قومیت اور پاپائیت نما روحانیت، ختم نہیں ہوئے ہونگے، بلکہ عوامی عمل و حرکت اِن جذبات کو پھر بھڑکانے کا

سبب بنے گا۔ پس لوگوں کے اندر بیکار تصورات جیسے فرقہ واریت اور مسلک پرستی، پرانے افکار جیسے آزادیاں، اوراسی طرح نسل پرستی اور قبائلیت پر مبنی غلط قسم کے نعرے پھر سے اُبھر آئیں گے۔ یوں لوگوں اور حزب کے درمیان تضاد پیدا ہو جائے گا کیونکہ لوگ حزب سے ایسے مطالبات کا تقاضا کریں گے جن کی بنیاد آئیڈیالوجی نہیں ہوگی۔ وہ کچھ ایسے وقتی مقاصد کی طرف دعوت دیں گے جو امت کے لیے نقصان دہ ہونگے، اوران مطالبات کے لیے بہت پرُ جوش ہونگے اور اُن کا یہ جوش اِن مطالبات کے حصول کے لیے بڑھتا جائے گا۔ اِن حالات میں حزب کو دو مشکل صورتوں میں سے ایک صورت کا انتخاب کرنا پڑے گا: ایک یہ کہ حزب امت کے غصے اور غضب کا سامنا کرے اور پھر نتیجتاً اُس تمام سے ہاتھ دھو بیٹھے جو اُس نے معاشرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کیا تھا یا پھر دوسری صورت میں وہ اپنی آئیڈیالوجی سے روگردانی کرے اور آئیڈیالوجی کے بارے میں لچک کا مظاہرہ کرے۔ تاہم یہ دونوں صورتیں حزب کے لیے انتہائی خطرناک ہونگی۔ اس وقت حزب کے اراکین کو چاہیے کہ جب کبھی لوگ اور آئیڈیالوجی باہم متصادم ہوں تو وہ ہر حال میں صرف آئیڈیالوجی ہی کو تھام لیں، چاہے ایسی صورت میں انہیں امت کی ناراضی کا ہی سامنا کیوں نہ کرنا پڑے کیونکہ امت کا یہ غصہ عارضی ہوگا۔ جبکہ آئیڈیالوجی پر جمے رہنے سے ان پر امت کا اعتماد دوبارہ بحال ہوجائے گا۔ اور حزب کو آئیڈیالوجی کے خلاف کرنے اور آئیڈیالوجی کی روح سے بال برابر بھی انحراف کرنے سے محتاط رہنا ہوگا۔ کیونکہ آئیڈیالوجی ہی حزب کی زندگی ہے اور یہی حزب کی بقا کی ضمانت ہے۔ ایسی نقصان دہ صورتِ حال سے بچنے اور ان جیسے خطرات کو ٹالنے کے لیے حزب کے لیے ضروری ہے کہ وہ امت کو اپنی آئیڈیالوجی سے سیراب کرنے، حزب کے افکار اور تصورات کی وضاحت اور امت پر ان افکار وتصورات کے غلبے کے تسلسل کے لیے بھرپور کوشش کرے۔ اس طرح حزب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس عرصے میں تربیت (ثقافت دینے) کی پوری کوشش کرے، لوگوں کی اجتماعی ثقافت کا زبردست اہتمام کرے، اس طرح استعماری منصوبوں کو بڑی باریک بینی سے بے نقاب کرے، امت اور اس کے مفادات کی ہمیشہ نگرانی کرے، امت کو مکمل طور پر آئیڈیالوجی اور حزب کے سانچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش

جاری رکھے اور اس کے ساتھ حزب کے افکار وتصورات کو ہمیشہ صاف وشفاف رکھنے کے لیے ان کی جانچ پڑتال کرتی رہے، چاہے اس کام کے لیے کتنی ہی محنت اور توجہ کی ضرورت ہو اس کے لیے مقدور بھر کوشش کرے۔

رہی بات طبقاتی خطرے کی تو یہ امت کے نہیں بلکہ حزب کے افراد کے اندر سرایت کرسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حزب کو امت یا امت کی اکثریت کی نمائندگی حاصل ہو جائے گی تو اس وقت اس کا ایک بڑا مرتبہ ومقام ہوگا، اسی طرح امت اور بااثر افراد کے اندر حزب کی بڑی قدر ومنزلت ہوگی، جو نفس میں غرور کا باعث بن سکتی ہے۔ چنانچہ حزب کے اراکین اس گمان میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ وہ امت سے بہتر ہیں اور ان کا کام قیادت ہے جبکہ امت کا کام یہ ہے کہ وہ حزب کی قیادت کے تحت چلے۔ اور حزب کے اراکین اپنے آپ کو امت یا امت کے بعض افراد سے بہتر سمجھیں امت کو کسی شمار و قطار کے قابل نہ سمجھیں۔ جب اس طرز عمل کو دہرایا جائے گا تو امت سمجھنے لگے گی کہ حزب ان کے علاوہ کوئی اور طبقہ ہے اور حزب بھی اپنے آپ کو ایک اور طبقہ سمجھنے لگے گی۔ یہ احساس حزب کے زوال کی طرف پہلا قدم ہوگا کیونکہ اس سے حزب کا لوگوں پر اور لوگوں کا حزب پر اعتماد مجروح ہوگا یوں امت حزب سے منہ موڑ لے گی۔ اور جب امت نے حزب سے منہ موڑ لیا تو حزب کا انہدام ہو جائے گا، اور اس اعتماد کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے کئی گنا زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حزب کے اراکین کو چاہیے کہ وہ یہ سمجھیں کہ وہ بھی امت کے عام افراد ہیں اور امت کے خادم ہیں اور ان کا کام امت کی خدمت کرنا ہے۔ چنانچہ اس سے نہ صرف لوگوں کا ان پر دائمی اعتماد ہوگا بلکہ وہ زوال کے خطرے سے بھی محفوظ ہونگے اور یہ اس وقت بھی ان کے لیے فائدہ مند ہوگا جب وہ تیسرے مرحلے میں آئیڈیالوجی کو نافذ کرنے کے لیے حکومت حاصل کرینگے۔ تب وہ حکمران ہوکر بھی امت کی نظروں میں خادم ہونگے، جو اُنکے لیے آئیڈیالوجی کے نفاذ کو آسان بنائے گا۔

18) تیسرا مرحلہ حکومت حاصل کرنے کا مرحلہ ہے۔

حزب امت اور نصرۃ کے ذریعے حکومت حاصل کرے گی اور آئیڈیالوجی کو یکبارگی نافذ کرے گی، جسے انقلابی طریقہ کہا جاتا ہے۔ یہ انقلابی طریقہ حکومت میں جزوی شرکت کو قبول نہیں کرتا بلکہ مکمل قوت و اختیار حاصل کر کے اسے آئیڈیالوجی کے کامل نفاذ کا طریقہ قرار دیتا ہے۔ یہ اسلامی آئیڈیالوجی کے مکمل نفاذ کو ہی قبول کرتا ہے، قطع نظر کہ حالات کیا ہیں، اور کسی بھی صورت میں تدریجی نفاذ کو قبول نہیں کرتا۔

پس جب ریاست آئیڈیالوجی کو مکمل اور جامعیت کے ساتھ نافذ کر چکی ہوگی تو تب اسلامی دعوت کو آگے بڑھانا ریاست پر لازم ہے اور اس کام کی خاطر ریاستی بجٹ میں ایک خاص حصہ دعوت کو پھیلانے کے لیے مقرر کیا جائیگا۔ ریاست اس دعوت کی نگرانی کرے گی چاہے یہ ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کے ذریعے سے ہو یا پھر حزب کے ذریعے سے ہو، چنانچہ اس کا تعین حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوگا۔ حزب حکومت حاصل ہونے کے باوجود ایک جماعت کے طور پر کام کرتی رہے گی اور اس کا ڈھانچہ برقرار رہے گا، خواہ اس کے اراکین حکومتی عہدوں پر فائز ہوں یا نہ ہوں۔ حکمرانی حزب کی آئیڈیالوجی کو ریاست میں نافذ کرنے کی طرف پہلا قدم تصور ہوگا اور یہ پوری دنیا میں اس آئیڈیالوجی کے نفاذ کی کوشش کے سلسلے میں بھی پہلا قدم ہوگا۔

یہ وہ اقدامات ہیں جن کے ذریعے حزب کارزارِ حیات میں آگے بڑھے گی تاکہ وہ فکر (فکرۃ) کو عملی دور کی طرف منتقل کرے، یعنی اسلامی طرزِ زندگی کے ازسرنو آغاز، معاشرے کی نشاۃِ ثانیہ اور اسلامی دعوت کو پوری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے ذریعے اس آئیڈیالوجی کو کارزارِ حیات کی طرف منتقل کیا جائے۔ یہی وہ مقام ہوگا جہاں سے حزب کے عملی دور کا آغاز ہوگا کہ جس کے لیے حزب کو قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ حزب ہی اسلامی ریاست کے قیام، اُس کے تسلسل، اسلام کے بہترین اور دائمی نفاذ اور اسلامی دعوت کو پوری دنیا کے سامنے پیش کرنے کی حقیقی ضمانت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ ایک بار ریاست کو قائم کر لے گی تو یہ جماعت ہی اس ریاست کی نگرانی، اس کا محاسبہ کرنے اور اس کے ساتھ بحث و مباحثہ میں امت کی قائد ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اسلامی علاقوں اور باقی تمام دنیا میں اسلامی دعوت کو پیش کر رہی ہوگی۔